

جاسوسی دنیا

27- چار شکاری

28- بے گناہ مجرم

29- لاشوں کا آبشار



جاسوسی دنیا

جلد نمبر 9

چار شکاری

27

بے گناہ مجرم

28

لاشوں کا آبشار

29

ابن صفی

اسرارِ پبلی کیشنز

الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ

اردو بازار لاہور۔ فون : 7321970 - 7357022

جملہ حقوق محفوظ

اس ناول کے نام ، مقام ، کردار اور کہانی سے
تعلق رکھنے والے اداروں کے نام فرضی ہیں۔

پبلشر..... خالد سلطان

پرنٹر..... ہاشم انٹرپرائزز

سیل ڈپو: عثمان ٹریڈرز

الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ

اردو بازار لاہور۔ فون : 7321970

جاسوسی دنیا نمبر 27

چار شکاری

(مکمل ناول)

پیشکش

جو داستان پیش کی گئی ہے اپنی دلچسپی کے اعتبار سے ابن صفی کے دوسرے کارناموں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں۔ اس ناول میں سرجنٹ حمید نے صحیح معنوں میں خود کو فریدی کا جانشین ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک خوفناک سازش کا شکار ہو کر قانون کی نظروں میں مجرم بن جاتا ہے اور اُسے روپوشی اختیار کرنی پڑتی ہے.... ایک ایسی لڑکی قتل کر دی جاتی ہے، جو سرجنٹ حمید کو کسی ریاست کا شہزادہ سمجھتی ہے.... کیوں سمجھتی تھی؟.... اس پر خود حمید کو بھی حیرت تھی.... ایک بینک کا ڈیڑھ من سونا خاک ہو جاتا ہے.... ایسے شکاری جو کوؤں کا شکار کھیلتے تھے.... بھلا سونے کی خاک اور کوؤں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے.... لیکن فریدی اپنی حیرت انگیز معلومات کی بناء پر دونوں کا تعلق ڈھونڈ ہی نکالتا ہے.... حمید تنہا مجرموں کا مقابلہ کرتا ہے اور ایک جگہ شراب پی کر وہ کتوں کی طرح بھونکتا ہے.... مجبوراً فریدی کو اس پر ٹھنڈا پانی ڈالنا پڑتا ہے.... چاروں شکاری کیا کر رہے تھے.... انہوں نے جو ڈھونگ پھیلایا تھا اس کے لئے پس منظر میں کیا تھا؟

میرا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو بار بار پڑھیں گے۔

(پبلشر)

شامت

تین موٹر سائیکلیں برابر سے سڑک پر دوڑ رہی تھیں۔ سرجنٹ حمید نے کئی بار کوشش کی کہ اپنی موٹر سائیکل ان کے درمیان سے نکال لے جائے لیکن کامیاب نہ ہوا۔ وہ تینوں رہ رہ کر ایک ساتھ اس طرح لہریں لیتی تھیں کہ سڑک کی پوری چوڑائی ان کے حیطہ عمل میں آ جاتی تھی۔ حمید ہارن پر ہارن دیتا رہا لیکن ان تینوں سواروں کے کانوں پر جوں تک نہ رہی تھی۔ حمید کو تاؤ آ گیا۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو شاید اُسے تاؤ نہ آتا لیکن بات دراصل یہ تھی کہ بچھلی سیٹ پر اُس نے ایک خوبصورت سی لڑکی کو بھی لاد رکھا تھا اور وہ راستے بھر اُسے طرح طرح کے کرتب دکھا کر اُس کی سریلی چیخیں سنتا آیا تھا۔ ایک بار تو اس بیچاری کو بالکل یقین ہو گیا تھا کہ وہ دونوں موٹر سائیکل سمیت چکنا چور ہو جائیں گے۔ ہوا یہ کہ حمید نے ایک سائیکل سوار کے قریب سے گذرتے وقت اُس کی ٹوپی اچک لی۔ توازن جو گڑ بڑایا تو موٹر سائیکل سڑک کے نیچے اتر گئی۔ اگر حمید نے فوراً ہی ہینڈل نہ سنبھال لیا ہوتا تو موٹر سائیکل دس پندرہ فٹ گہری کھائی میں چلی گئی ہوتی۔

اس نے تو وہیں سے واپسی کے لئے ہلچل مچانا شروع کر دیا تھا لیکن حمید پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ بالی کیمپ کے اکلوتے ریسٹوران میں اسٹیک کھائے بغیر واپسی کا سوال ہی نہ پیدا ہوگا۔ اس لڑکی کا نام سارہ تھا۔ یہ اینگلو انڈین تھی لیکن اردو اتنی صاف بولتی تھی کہ اہل زبان کا دھوکا ہوتا تھا۔ البتہ بعض اوقات باتوں کی رو میں لہجہ نہ سنبھال پاتی تھی۔ اس کے اور حمید کے تعلقات کے متعلق

صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ اس کی نئی دریافت تھی۔ ایک رقص گاہ میں ان کی ملاقات ہوئی اور پھر دونوں میں گاڑھی چھننے لگی۔

آج اتوار تھا۔ حمید فریدی سے کٹ کر سارہ کے ٹھکانے پر پہنچا اور اسے بالی کیمپ کی طرف لے اڑا۔ بالی کیمپ جنگ کے زمانے میں یقیناً کیمپ رہا ہو گا لیکن اب تو وہاں لوہے کے کئی کارخانے قائم ہو گئے تھے اور ان بارکوں میں مزدور رہنے لگے ہیں جن میں کبھی فوج رہا کرتی ہوگی۔ بہر حال پُر فضا جگہ ہونے کی بناء پر اب اُسے تفریح گاہ کی حیثیت سے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تار جام جانے والی سڑک کی ایک شاخ مشرق کی طرف مڑ گئی ہے۔ یہی بالی کیمپ کا راستہ ہے۔ اس سڑک کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں؟ یہ اب تک صرف ”بالی کیمپ والی سڑک“ کہلاتی ہے اس کے شروع پر ایک کھمبے پر ایک تیر نصب ہے جس پر ”بالی کیمپ“ لکھا ہے اور بس! سڑک کے دونوں طرف سرسبز نیلے ہیں جن پر اکثر بھیڑوں کے ریوڑ دکھائی دیتے ہیں۔ تار جام کی سڑک سے کٹنے کے بعد بالی کیمپ تک درمیان میں کوئی آبادی نہیں ملتی۔

”سارہ ڈارلنگ....!“ حمید گنگنایا۔ ”نکرا دوں.... کسی سے۔“

”میں نہیں جانتی۔“ سارہ کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ ”میری نس نس ٹوٹ گئی ہے۔“

”سارہ ڈارلنگ! اس وقت زندگی کا حسن بڑھ گیا ہے۔“

”تم سو رہو.... اب میں کبھی تمہارے ساتھ نہ نکلوں گی۔“

”اوہو.... تو تمہیں یقین ہے کہ تم آج زندہ جاؤ گی۔“

سارہ نے جھلا کر اُس کی پشت پر کے جھاڑنے شروع کر دیے۔ حمید نے موٹر سائیکل کو ایک گہری لہر دی اور آگے جانے والی موٹر سائیکلوں کے درمیان سے صاف نکال لے گیا لیکن وہ اپنے پیچھے بیٹھی ہوئی سارہ کی حرکات و سکنات سے قطعی لاعلم تھا۔ اُس نے اس سے اپنے کمال کی دہر ضرور چاہی مگر یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ ان تینوں کو کسی قسم کا اشارہ کرنے کے پھر اس کی پیٹھ پر دھولیں جمانے لگی تھی۔

”روکو! روکو!.... میں مری....!“ دفعتاً اُس نے چیخنا شروع کر دیا۔

حمید نے رفتار کم کر کے موٹر سائیکل سڑک کے کنارے لگا دی۔

”ہائے....!“ سارا سڑک کے کنارے بے تحاشہ گر کر کر رہی۔

”کیا ہوا....؟“ حمید اس پر جھک پڑا۔

”ہائے....!“ سارہ سڑک کے کنارے بے تحاشہ گر کر کراہی۔

”کیا ہوا....؟“ حمید اس پر جھک پڑا۔

”ہائے....!“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر اینٹھ گئی۔ ”پتہ نہیں.... کیا ہو گیا.... اُف.... ہائے۔“

تینوں موٹر سائیکلیں نظر سے اوجھل ہو گئی تھیں اور سڑک بالکل سناں تھی۔

حمید اسے سہار دے کر ٹیلوں کی طرف لے گیا۔

وہ گھاس پر لیٹ گئی۔

”آخر بتاؤ نا....!“

”پسیلوں میں.... نہ جانے کیا ہو گیا.... ہائے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ حمید نے بوکھلا کر کہا۔ ”اب یہاں کیا کیا جاسکتا ہے۔“

”مجھے دفن کیا جاسکتا ہے۔“ سارہ جھلا کر بولی۔

”یہ بھی مجھ اکیلے کے بس کا روگ نہیں۔“

”سور ہو تم.... چپ رہو.... ہائے.... ہائے۔“

”اچھا تو چلو.... اب کیمپ تھوڑی دور ہے.... وہاں ڈپنسری بھی ہے۔“

”چھوڑ دو مجھے.... چلے جاؤ یہاں سے۔ اُس نے گھاس پر لوٹ لگائی۔“

”یعنی تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں۔“

”اُف.... ہائے.... چپ رہو۔“

”اچھا چپ ہوں.... مگر....!“

”ہائے.... چپ....!“

”ارے.... پھر چپ۔“

حمید نے کئی بار جھنجھلا کر اپنا سر پیٹ لینے کا ارادہ کیا لیکن.... کامیاب نہ ہوا۔ سارا برابر کراہے جا رہی تھی۔ نہ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر بقیہ راستہ طے کرنے پر رضامند ہوتی تھی اور نہ یہی بتاتی تھی کہ تکلیف کی نوعیت کیا ہے۔ وہ سراپیمگی کی حالت میں ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ ٹیلے کی دوسری جانب سے ایک آدمی اُن کی طرف آتا نظر آیا۔ سارہ کو زمین پر تڑپتے دیکھ کر وہ

رک گیا۔ پھر اُس نے جواب طلب نظروں سے حمید کی طرف دیکھا۔ وضع قطع سے کسی اچھی سوسائٹی کا فرد معلوم ہوتا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اُس نے حمید سے پوچھا۔

”اچانک دونوں پسلیوں میں کچھ.... نہیں بلکہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”افوہ.... مطلب ہی پر تو میں بھی غور کر رہا ہوں۔“

”خیر! میرے لائق کوئی خدمت۔“ اُس نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ حمید پر جھلاہٹ سوار ہو رہی تھی۔

”میرے خیال سے انہیں ادھر لے چلے۔“ اُس نے ٹیلے کی دوسری طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی ہے۔“

ٹیلے کے دوسری طرف والے نشیب میں تین چار آدمی مختلف قسم کی تفریحات میں مشغول تھے۔ اُن کے ساز و سامان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس طرف پلنک کی غرض سے نکل آئے ہیں۔ تھوڑے فاصلے پر ایک خوبصورت سی کار بھی کھڑی ہوئی تھی۔

حمید اور سارہ کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ سارہ ہولے ہولے کراہتی ہوئی حمید کے سہارے چل نہیں بلکہ ریگ رہی تھی۔ ان کے ساتھ والے آدمی نے اپنا کوٹ اتار کر زمین پر بچھا دیا اور سارا کروٹ کے بل گر کر ہانپنے لگی۔

”ڈاکٹر....!“ حمید کے ساتھ والے نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

”اچانک ان کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔“

”اوہ....!“

”ڈاکٹر....!“ حمید نے اپنے ذہن میں دہرایا اور بغور اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

خدا و خال کچھ جانے پہچانے سے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اُس نے اُسے کہاں دیکھا تھا۔ جب کچھ یاد نہ آیا تو اُس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالیہ نشان کو تاریک گوشوں میں دھکیل دیا۔

ڈاکٹر سارہ پر جھکا ہوا اُس سے تکلیف کی نوعیت معلوم کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر

اٹھا کر کہا۔

”کوئی تشویش ناک بات نہیں! اکثر اچانک جھٹکوں کی بناء پر رگوں اور پٹھوں میں اس قسم کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ میرے خیال سے تھوڑی سی برانڈی مناسب رہے گی۔“

”برانڈی....!“ حمید نے سارہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہمارے پاس موجود ہے۔“ ایک آدمی باسکٹ میں ہاتھ ڈالتا ہوا بولا۔

اُس نے گلاس میں تھوڑی سی برانڈی انڈیل کر سارہ کی طرف بڑھادی۔ سارہ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے زمین پر لڑھکادیا اور پھر لیٹ گئی۔

سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ حمید شدت سے بور ہو رہا تھا۔ ساری تفریح کر کر کر ہو کر رہ گئی تھی۔ اب بالی کیپ پہنچنے سے زیادہ اُسے واپسی کی فکر تھی۔ لیکن سارہ کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کم از کم ایک آدھ گھنٹے سے قبل واپسی کے لئے تیار نہ ہو سکے گی۔

حمید مجبوراً موٹر سائیکل بھی اسی طرف دھکیل لایا۔

”شاید آپ اسٹوڈنٹ ہیں۔“ ڈاکٹر نے حمید کو مخاطب کیا۔

”جی ہاں۔“ حمید نے خاکسارانہ انداز میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں کی تفریح

میں خلل پڑا۔“

”نہیں بالکل نہیں۔“ ڈاکٹر ہنس کر بولا اور اپنے آگے رکھے ہوئے گلاس میں برانڈی انڈیلنے لگا۔

بقیہ لوگوں نے بھی اپنے گلاس سنبھال رکھے تھے۔

”آپ بھی لیجئے۔“ ڈاکٹر نے اپنا گلاس حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جی.... شکریہ.... میں نہیں پیتا۔“

”مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔

”حقیقت عرض کر رہا ہوں۔“

”کیا آپ نے کبھی نہیں پی۔“

”یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔“

”دیکھئے میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔“ ڈاکٹر نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ عادی

نہیں۔ لیکن خبر جانے دیجئے بعض کمزور دماغ کے آدمی بہکنے کے خوف سے پینے سے گریز کرتے ہیں۔“

اس جملے پر حمید کو تاؤ آگیا اور پھر اُس نے یہ ثابت کرنے کے لئے گلاس اٹھالیا کہ وہ اعصابی کمزوری کا شکار نہیں ہے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اسے ایک ہی سانس میں خالی بھی کر دیا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں سارہ کی طرف دیکھا اور وہ ڈاکٹر کو مخاطب کر کے بولی۔

”کیا آپ کی برانڈی مفت کی ہے۔“

”نہیں تو.... کیوں؟“

”آپ نے بہت بُرے آدمی کو دعوت دی ہے۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”آپ کو پوری بوتل کی یاد میں آنسو بہانے پڑیں گے۔“

”نہیں.... خیر.... اتنے پیکڑ نہیں معلوم ہوتے۔“ ڈاکٹر حمید کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

”حمید نے انتہائی بے تکلفی سے بوتل اٹھائی اور کافی مقدار میں برانڈی انڈیل کر سوڈے کی بوتل کھولنے لگا۔ ڈاکٹر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ حمید کو دعوت دے کر سچ مچ حماقت کر بیٹھا ہو۔

”معاف کیجئے گا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”دو تین پگ میں تو میرے کان بھی گرم نہیں ہوتے۔“

اُس نے دوسرا گلاس بھی پیا نہیں بلکہ پیٹ میں انڈیل لیا۔ شنجی میں آکر اُس نے یہ حرکت کر تو ڈالی لیکن یہ سوچ رہا تھا کہ سینے کی خراش عرصے تک تکلیف کا باعث بنی رہے گی۔ برانڈی کافی تیز اور پرانی معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے آدمیوں کے چہروں پر تحیر کے آثار دیکھ کر اُس نے تیسرے گلاس کے لئے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سارہ ہنسنے لگی۔

”معاف کیجئے گا۔“ ڈاکٹر نے بوتل اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ بڑی بے دردی سے پی رہے

ہیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

اس نے بوتل باسکٹ میں ڈال دی۔

”دیکھئے آپ مہمان نوازی کی روایات کو پانی پلا رہے ہیں۔“ حمید ہنس کر بولا۔ پھر دفعتاً اسے

احساس ہوا کہ واقعی چڑھ رہی ہے۔ وہ ”پانی پھیرنے“ کے مجازوں کو غلط بول گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ نشے میں اُس نے روایات کو پانی پلا دیا۔ اس نے دوبارہ اپنے جملے پر غور کیا تو اُسے بڑے زور سے ہنسی آگئی۔

وہ لوگ بھی ہنسنے لگے اور حمید اپنے ذہن سے کشتی لڑنے میں مشغول ہو گیا۔ شراب واقعی بہت تیز تھی۔ اُسے اپنا جسم ہوا میں پیٹنگیں لیتا ہوا معلوم ہونے لگا تھا۔ اُسے اپنی حماقت پر غصہ آیا اور نشے کی تیزی کچھ اور بڑھ گئی۔ اور پھر جب شام کی ٹھنڈی ہوائ نے اُس کے کان سہلائے تو مزہ ہی آگیا۔

”اب چلو اٹھو۔“ اُس نے سارہ کو اس طرح ڈانٹا جیسے وہ اس کی بیوی ہو۔

”میری طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہوئی۔“ سارہ جھلا کر بولی۔

”ایسی جلدی بھی کیا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ابھی بہت وقت ہے۔ پانچ ہی تو بجے ہیں۔“

پھر وہ سب سارہ اور حمید کو لڑتے چھوڑ کر آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ یہ گفتگو سیاسی معاملات پر تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے حمید وغیرہ کی آمد سے قبل بھی اُن کا موضوع گفتگو سیاست ہی رہا ہو۔

ڈاکٹر شاید اپنے ساتھیوں کی کٹ جتنی سے عاجز آگیا تھا۔ اُس نے زچ ہو جانے والے انداز میں کہا۔ ”بھئی جیسے بعض سرکاری معاملات کا علم بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے اب تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔ اچھا اسے یوں سمجھ لو! بہترے آدمیوں کو معلوم ہے کہ دلا درنگر سے سونے کی بھاری مقدار یہاں آنے والی ہے۔ لیکن شاید انہیں یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کس تاریخ کو اور کس ٹرین سے آئے گی۔“

”معلوم کیوں نہ ہو گا۔“ ایک آدمی بولا۔

”قطعاً نہیں۔“ ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ”عوام کو ایسی باتیں نہیں معلوم ہونے پاتیں۔“

دفعۃً حمید فاتحانہ انداز میں ان کی طرف مڑا۔ اس کا دماغ اس وقت اس کی کھوپڑی کے اوپر لہرا رہا تھا۔

”کیا..... فر..... مایا آپ نے! عوام کو..... یہ باتیں نہیں معلوم..... ہا..... ہا..... پچس میں

بھی عوام ہوں..... لیکن..... پچس..... میں جانتا ہوں۔“

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

”اس وقت تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ خلیل خاں آج کل شتر مرغ اڑاتے ہیں۔“

”ہاں..... آپ..... اڑاتے تو ہیں۔ خلیل خاں میرے چچا ہیں۔“ حمید اپنے سینے پر ہاتھ مار

کر بولا۔

”واقعی چڑھ گئی ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا اور سب ہنسنے لگے۔ حمید کو غصہ آگیا۔

”تم پر چھاڑ گئی ہے۔“ وہ گرج کر بولا۔ ”میں بتا سکتا ہوں کہ سونا کب آ رہا ہے۔“

”یاد مت کان کھاؤ۔“ ڈاکٹر برا سامنہ بنا کر بولا۔ ”تمہیں پلا کر میں نے اپنے سر عذاب مول لے لیا۔“

”خدا قسم.... وہ تیرہ تاریخ کو سترہ ڈاؤن سے آئے گا۔“

وہ سب حلق پھاڑ کر ہنسنے لگے۔ حمید نے غصے میں اپنے ہی منہ پر تھپڑ مار لیا اور اتنا زوردار کہ اُسے لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ جانا پڑا۔

”شکر کرو کہ یہ تھپڑ میرے ہی منہ پر پڑا ہے۔“ وہ دانت پیسن کر بولا۔

”یاد کیا آفت مول لی ہے۔“ ڈاکٹر نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”اب اگر ان حضرات نے اس وقت موٹر سائیکل استعمال فرمائی تو سیدھے ملک الموت سے بغل گیر ہو جائیں گے۔“

”چوپ راؤ۔“ حمید جھومتا ہوا بولا۔ ”آؤ سارہ ڈارلنگ چالیں۔“

”ہرگز نہیں ایسی غلطی بھی نہ کیجئے گا۔“ ڈاکٹر نے سارہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہائیں.... تم میری محبوبہ پر.... عاشق ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔“ حمید ڈاکٹر کو مکا دکھا کر بولا۔ ”ہڈیاں چور کر دوں گا۔“

”صاحب زادے ہوش میں آؤ.... ورنہ....!“

”معاف کر دیجئے....!“ سارہ گھبرا کر بولی۔ ”یہ نشے میں ہیں۔“

”ڈارلنگ.... ڈارلنگ.... تم میری تو بین کر رہی ہو۔“

”چپ رہو۔“ سارہ نے اُسے ڈانٹا۔

”ہائے تم بھی ڈاکٹر ہو گئیں۔“ حمید گلوگیر آواز میں بولا۔

”میں کہتی ہوں، بالکل زبان بند رکھو۔“

”ارے تو بتاؤ نا کہاں بند رکھوں۔“

”آپ واپس کس طرح جائیں گی۔“ ڈاکٹر نے سارہ سے پوچھا۔ ”یہ تو بالکل بیکار ہیں۔“

”اگر میں بیکار ہوں تو تم واہیات ہو۔“ حمید حلق کے بل چیخا۔

”اگر آپ انہیں اور مجھے اپنی کار میں شہر تک پہنچادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“ سارہ نے کہا۔

”اور آپ میں سے کوئی ان کی موٹر سائیکل پر بیٹھ لیں۔“

”مٹو پر بیٹھ لیں۔“ حمید مکاتان کر سارہ کی طرف بڑھا۔

”آپ عجیب آدمی ہیں۔“ ڈاکٹر نے اُسے پکڑ لیا۔

”ہاٹ.... جاؤ.... میں اسے مار ڈالوں گا۔“

ان سب نے حمید کو پکڑ کر بٹھالیا۔ سارہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔

”ہانستی ہو.... گویا میں کتے کا پلا ہوں۔“

”چپ رہئے جناب.... آپ تو واقعی....!“ ڈاکٹر نے بیسی سے بولا۔

”نائیں چپ رہتا جناب.... آپ خود جناب۔“

ڈاکٹر کے ساتھ بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے اُن سے کہا بھی کہ ان دونوں کو اُن کے ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے لیکن انہوں نے دھیان نہ دیا۔

”آپ کا نام کیا ہے جناب!“

”کبھی نہیں.... بتاؤں گا.... تم لوگ مجھ کو اُلو سمجھتے ہو۔“

”نہیں نہیں.... ہم آپ کو اُلو سے بھی بڑی چیز سمجھتے ہیں۔“

”میں چیز ہوں....؟“ حمید بگڑ کر بولا۔ ”آپ خود چیز ہیں.... چیز.... چیزیں.... چیزوں....“

”.... چوزوں۔“

”میرے خیال سے آپ انہیں چھوڑیے اور چلے ہمارے ساتھ۔“ ایک نے سارہ سے کہا۔

”نہیں یہ ناممکن ہے۔“ سارہ بولی۔

”دیکھا تم نے.... دیکھا۔“ حمید اس کے چہرے کے سامنے انگلی نچا کر ہنسا۔ تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ حمید زمین پر داہنی کہنی ٹیک کر سارا کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”کیا کہتی ہیں آپ۔“ ڈاکٹر نے سارہ سے پوچھا۔

”کچھ نائیں کہتی.... جاؤ.... چالے جاؤ۔“ حمید نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

”مان جاؤ ڈار لنگ۔“ سارہ اس کا سر سہلا کر بولی۔

”ہائے.... ایسے بولونا.... مان گیا.... چالو۔“

حمید لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور وہ سب زمین پر بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگے۔

کار میں بیٹھتے ہی حمید کا نشہ ہرن ہونے لگا کہ سارہ اُسے اس حالت میں اپنے کوارٹر میں تو ہرگز نہ لے جائے گی۔ سارہ نرس تھی اور ہسپتال کے سرکاری کوارٹر میں رہتی تھی اور حمید نے اُسے اپنی جائے رہائش کے متعلق آج تک کچھ نہ بتایا تھا۔ پھر فریدی اور اس کی باز پرس کا خیال آتے ہی اُس کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی! وہ شروع ہی سے اس جدوجہد میں مصروف تھا کہ نشہ کو اپنے ذہن پر غالب نہ آنے دے مگر رہ کر اٹھنے والی اس لہر کو کیا کرتا، جو اُسے بہکنے پر مجبور کر رہی تھی اچانک ذہن نے پھر پلٹنا کھلایا اور اُسے اپنے اوپر غصہ آنے لگا کہ آخر وہ فریدی سے اتنا ڈرتا کیوں ہے، یہ بزدلی ہے۔ کمزوری ہے۔ بالکل کمزوری ہے۔

”میں پیوؤں گا.... اور پیوؤں گا....!“ وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”کسی کے باپ کا سا بھلا۔“

”خرید کر پینا.... بر خور دار....!“ ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔

”خرید کر پیوؤں گا.... پرید کر خیوں گا۔ سمجھتے ہو۔ میں بزدل نہیں ہوں۔“

مرمت

کمپاؤنڈ میں شور سن کر فریدی باہر نکل آیا۔ دو تین نوکر کتے خانے کے قریب کھڑے ہنس رہے تھے۔ وہ اُس طرف اندھیرا ہونے کی بناء پر اُن کے چہرے نہ دیکھ سکا لیکن ہر ایک کی آواز وہ بخوبی پہچان رہا تھا۔

”کیا بات ہے....!“ اُس نے بلند آواز میں پوچھا۔

سانا چھا گیا۔ نوکر خاموش ہو گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اُس نے کسی آدمی کو کتوں کی طرح بھونکتے سنا۔

”کیا بیہودگی ہے۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ تینوں نوکر وہاں سے ہٹ کر پور نیکیو میں آگئے۔

بھونکنے کی آواز بدستور جاری تھی۔

”کیا ہے....؟“ فریدی کو غصہ آگیا۔

”حمید صاحب۔“ ایک نوکر نے کہا اور بے ساختہ ہنس پڑا۔

”اندر جاؤ۔“ فریدی انہیں گھور کر بولا۔ پھر اُس نے حمید کو آواز دی لیکن وہ برابر بھونکتا رہا۔
فریدی جھنجھلاہٹ میں آگے بڑھا۔

حمید کتے خانے کے کٹہرے سے منہ ملائے زمین پر بیٹھا بھونک رہا تھا۔

”یہ کیا حرکت....!“

”بھوں....!“ حمید نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

فریدی نے اُس کی گردن پکڑ کر اُسے ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

”چیاؤں.... چیاؤں.... چیاؤں۔“ حمید اس طرح چلایا جیسے کوئی کتا پتھر کھا کر بھاگتے وقت

آوازیں نکالتا ہے۔

”یہ بات ہے۔“ فریدی آہستہ سے بڑبڑایا۔ حمید کے منہ سے بو آرہی تھی۔ اتفاقاً اس کا ہاتھ اس کے کوٹ کی جیب سے نکل گیا جس میں حمید نے بوتل ٹھونس رکھی تھی۔

ہوایہ کہ شہر پہنچ کر حمید نے موٹر سائیکل تو دولت گنج کے تھانے میں چھوڑی دیا اور وہاں سے ٹیکسی کر کے ہوٹل ڈی فرانس میں آیا۔ یہاں اُس نے ڈرائی جن کی ایک بوتل خرید لی۔
چوتھائی بوتل وہیں صاف کر دی اور بقیہ جیب میں ڈال کر پھر ٹیکسی پر بیٹھا اور گھر آ گیا۔

”کیوں سو.... یہ کیا حرکت۔“ فریدی نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچی اور دوسرے سے بوتل نکال کر زمین پر پٹختی دی۔

”میں بزدل نائیں ہوں۔“ حمید پوری قوت سے چیخا۔

”نائیں کے بچے ابھی بتاتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور اسے کھینچتا ہوا اندر لے چلا۔

”او.... سارہ.... ڈارلنگ۔“ حمید دردناک آواز میں چلایا۔

فریدی نے اُسے برآمدے کے فرش پر دھکیل دیا۔ سارے نوکر اکٹھا تھے۔

”اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔“ فریدی ان کی طرف مڑ کر بولا۔

وہ سب چپ چاپ چلے گئے۔

”کیوں سو.... تم نے پھر شراب پی۔“ فریدی نے اُس کے دونوں کان جھنجھوڑ کر کہا۔

”اکھڑ گئے.... ہائے اکھڑ گئے۔“ حمید گالوں پر کان ڈھونڈ رہا تھا۔

”میں آج تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔“

”سارہ ڈارلنگ.... اوہو ہو ہو۔“

فریدی اُسے دوبارہ اٹھا کر دھکے دیتا ہوا اندر لے جا رہا تھا۔

”اپنے ساتھ مجھے بھی بدنام کرتے ہو۔“

”میں پیوں گا.... پھر پیوں گا.... مجھے کوئی نہیں روخ سکتا۔“ حمید جھومتا ہوا بولا۔

”میں اپنے باپ کی گود میں بیٹھ کر پیوں گا۔“ پھر اُس نے کان پر ہاتھ رکھ کر ہانک لگائی۔

”پینے کے دن آئے پیئے جا۔“

اس کے بعد شائد وہ کمر پر ہاتھ رکھنا چنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ فریدی نے اُس کی ناگوں میں اپنا

پیراڑا دیا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

”مار ڈالوں گا۔“ حمید اٹھ کر فریدی کی طرف جھپٹا اور فریدی کو ہنسی آگئی اس نے پھر اپنی

ناک آگے بڑھادی اور حمید پھر گر پڑا۔

اس بار وہ خود سے نہ اٹھ سکا فریدی نے کھینچ کھانچ کر اُسے سیدھا کیا۔

”کس نے پلائی ہے تمہیں۔“ اُس نے حمید کو جھنجھوڑا۔

”بو قتل نے.... بو قتل میں سے ہے، میں نشہ.... ارے ہاں۔“

”تم نے پچھلی بار قسم کھائی تھی نا۔“ فریدی نے پھر اس کا کان پکڑا۔

”پچھلی کب کھائی تھی۔“

”سارہ کون ہے؟“

”سارہ.... سارہ ہے! بارہ بارہ ہے۔ تیرہ چودہ ہے.... چودہ سہی ایک بنا دو ہے۔“

فریدی نے اُسے دھکے مار مار کر ڈرائنگ روم سے بھی نکالا اور اب وہ اسے غسل خانے کی

طرف لئے جا رہا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے حمید کی گردن پکڑی اور دوسرے سے ٹل کھول دیا۔

پانی کی تیز دھار حمید کے سر پر گر رہی تھی۔

”ارے.... ہوق.... ہوق.... پھو.... پھو.... ارے مرا.... پھو....!“

”پھر پیو گے۔“

”نہیں.... ارے.... پھو.... پھو.... مرا....!“

تھوڑی دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا۔

پھر وہ اُس کے سونے کے کمرے میں لے آیا۔ حمید کا نشہ تو خاک اترتا البتہ اُس کا سر آہستہ آہستہ بھاری ہوتا جا رہا تھا اور وہ خاموشی سے فریدی کو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا جیسے وہ اُس کے لئے کوئی اجنبی ہو۔ فریدی نے اس کا سر تولنے سے خشک کیا اور بھیکے ہوئے کپڑے اتارنے لگا۔

”تمہاری حرکتیں اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ دراصل فریدی کا یہ جملہ ایک بے معنی بے ربطی کے ساتھ اس کے ذہن میں اترتا تھا۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ذہن کا بوجھ اس کی زبان پر بھی حاوی ہو گیا اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اب چپ چاپ سو جائے۔

دوسری صبح وہ دونوں ایک دوسرے سے اٹنٹھے ہوئے تھے۔ حمید کو پچھلی رات کی ساری باتیں ایک بے ربط خواب کی طرح یاد تھیں۔ حمید شرمندہ بھی تھا اور وہ حقیقتاً فریدی کا سامنا کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ ناشتے کی میز پر بھی دونوں خاموش ہی رہے حمید محسوس کر رہا تھا کہ فریدی اس کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کر رہا ہے۔

ناشتہ ختم کرنے کے بعد حمید نیکی کر کے دولت گنج چلا گیا تھا۔ تھانے سے موٹر سائیکل لینی تھی۔ تھانے کا سینڈ آفیسر اس کا گہرا دوست تھا اس نے حمید کو چھیڑا۔ لیکن حمید کا موڈ اس قابل ہی نہیں تھا کہ وہ تھوڑی دیر رک کر اس سے گپ لڑاتا۔

وہ دولت گنج سے سیدھا آفس پہنچا۔ فریدی کی کید یا لاک تو کمپاؤنڈ میں موجود تھی۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھا۔ سرجنٹ رمیش اپنی ڈسک پر سر جھکائے کسی فائیل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ حمید کی آہٹ پر چونک پڑا۔

حمید اپنی ڈسک کی طرف بڑھا۔

”سننا تو یار ذرا۔“ رمیش نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”سن رہا ہوں۔“ حمید نے مڑے بغیر جواب دیا۔

”آج صاحب کا موڈ اتنا بگڑا ہوا کیوں ہے۔“

”رات زیادہ پی گئے ہوں گے۔“ حمید نے اپروائی سے کہا۔

”تو کیا پینے بھی لگے ہو۔“

”کب نہیں پیتا تھا۔“

حمید اپنی ڈسک پر آ بیٹھا۔ اُس کی طبیعت بھاری ہو رہی تھی اور دل چاہ رہا تھا کہ کرسی ہی پر بیٹھے بیٹھے سو جائے۔ رہ رہ کر سارے جسم میں کچھ ایسی لہریں دوڑتی معلوم ہو رہی تھیں جو کبھی گرم جان پڑتیں اور کبھی ٹھنڈی! نختوں سے چنگاڑیاں سی نکل رہی تھیں۔

”آج انسپکٹر صاحب بھی کچھ جھنجھلائے ہوئے ہیں۔“ رمیش بولا۔

حمید کوئی جواب دینے کی بجائے اپنی ڈسک آہستہ آہستہ کھٹکھٹانے لگا۔ رمیش چند لمحے اس کی طرف مضحکہ انداز میں دیکھتا رہا۔ پھر فائل کی ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔

حمید ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ ایک عجیب قسم کی آلتاہٹ اس کے ذہن پر مسلط تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا سارا حسن ختم ہو گیا ہو۔ کائنات کی رگیں ٹوٹ رہی ہوں اور انہیں کے ساتھ رجاہیت کا وہ تانا بانا بھی ٹوٹ رہا ہو۔ جو اس نے اپنی شخصیت کے گرد پھیلا رکھا تھا۔ ایک بے نام سی خلش اُس کے سینے میں رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔

دفعتاً اُس کی نظریں یوں ہی غیر ارادی طور پر اُس فائل کی طرف اٹھ گئیں۔ جسے سر جٹ رمیش الٹ پلٹ رہا تھا۔

”ذرا ٹھہرو تو....!“ اس نے کہا اور تیزی سے اٹھ کر رمیش کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے وہ صفحہ چمکی سے پکڑ لیا جسے رمیش الٹنے جا رہا تھا۔

اس کی نظریں اسی صفحے پر چمکی ہوئی ایک تصویر پر جم گئی تھیں۔ اچانک اسی کی طبیعت کا اضمحلال غائب ہو گیا اور سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔

اتنے میں فریدی آ گیا۔ اُس نے ایک اچلتی سی نظر حمید پر ڈالی اور اپنے میز پر رکھے ہوئے کاغذات الٹنے پلٹنے لگا۔

حمید پھر اپنی ڈسک پر آ بیٹھا۔ رمیش کو اس کے رویے پر حیرت تھی۔ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکا اور حمید یہ بھول گیا تھا کہ وہ آفس کے کمرے میں بیٹھا ہے اور وہاں اس کے ماں، باپ، آدمی اور بھی ہیں۔ رمیش تھوڑی دیر تک اسے گھورتا رہا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

حمید کا ذہن ایک بھورے رنگ کی ڈاڑھی کا ایک ایک بال جن رہا تھا۔ اور پھر جب وہ ڈاڑھی غائب ہو گئی تو حمید بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کل ہی اسے یہ یاد آ گیا ہو تاکہ

اُسے ڈاکٹر کا چہرہ جانا پہچانا سا کیوں معلوم ہو رہا تھا تو اس وقت فریدی اُسے انہینے کی بجائے اس کی پیٹھ ٹھونک رہا ہوتا۔

فریدی کے میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ریسپور اٹھالیا۔
 ”یس۔۔۔ فریدی اسپتالنگ۔۔۔ اوہ جگد لیش۔۔۔ کیا بات ہے۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔
 اچھا۔۔۔ تو پھر۔۔۔ یار مجھے ناحق تکلیف دیتے ہو۔۔۔ کچھ رقابت۔۔۔ وقابت کا سلسلہ رہا ہوگا۔
 ان لوگوں کو اکثر اسی قسم کے حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ یہ درجنوں چاہنے
 والے رکھتی ہیں۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ چھوڑو۔۔۔ میں بہت مصروف ہوں۔۔۔ تھوڑی پوچھ کچھ
 کرو۔۔۔ سب معلوم ہو جائے گا۔۔۔ اس کے عاشقوں کی فہرست تیار کرنا زیادہ مفید ہوگا۔۔۔ اماں
 بچے ہی رہو گے ہمیشہ۔۔۔ اسکے ساتھ والیوں سے پوچھو۔۔۔ اگر کوئی خاص دشواری ہو تو بتانا۔۔۔!“
 فریدی نے ریسپور رکھ کر سگار سلگایا اور حمید کو تیکھی نظروں سے دیکھتا ہوا رمیش سے مخاطب
 ہو گیا۔

”سول ہسپتال کی۔۔۔ کوئی نرس تھی سارہ۔۔۔ کسی نے اُسے قتل کر دیا۔“
 ”کیا۔۔۔؟“ حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

فریدی اس کا نوٹس لئے بغیر سگار پیتا رہا۔ حمید بیٹھ گیا۔ اُس کا سر چکرانے لگا تھا۔ سارہ قتل
 کر دی گئی کیوں؟ کس لئے؟ کس نے قتل کیا؟ مگر ممکن ہے کوئی اور سارہ ہو! لیکن پھر بھی اس کی
 الجھن رفع نہ ہوئی۔ وہ اٹھ کر تیزی سے فون کے قریب آیا۔

”ہیلو۔۔۔!“ اُس نے ریسپور اٹھالیا۔ اُس کا اندازہ پہلے ہی سے تھا کہ جگد لیش سول ہسپتال ہی
 سے بولا ہوگا اس لئے اس نے وہیں کے لئے رنگ کیا۔ ”سول ہسپتال۔۔۔ ذرا انکسٹر جگد لیش کر
 فون پر بلا دیجئے۔“

اُسے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑتا۔ دوسری طرف سے جگد لیش کی آواز آئی اور حمید بولنے لگا۔
 ”ہیلو۔۔۔ میں فریدی بول رہا ہوں۔“

اس پر فریدی نے اُسے گھور کر دیکھا لیکن حمید بولتا ہی رہا۔ ”کیا وہ کوارٹر ہی میں پائی گئی
 ہے۔۔۔ اوہ۔۔۔ کوارٹر کا نمبر کیا ہے۔۔۔ سولہ۔۔۔ اوہ۔۔۔ اچھا۔“
 حمید ریسپور رکھ کر اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔

فریدی پہلے سمجھا تھا کہ شاید حمید اُسے گھسنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اُس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ چونک پڑا۔ حمید کی آنکھوں میں سراسیمگی تھی۔

”کیوں....؟“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

حمید اُسے باہر چلنے کا اشارہ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

فریدی متحیرانہ انداز میں اُس کے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں لان پر نکل آئے۔

حمید چند لمحے فریدی کے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”کل میں سارہ

کے ساتھ تھا۔“

”تم....!“

”جی ہاں۔“ اور میں یہ نہیں سمجھتا کہ اس کی موت رقابت کے سلسلے میں واقع ہوئی۔

”کیوں....؟“

”کل میں نادانستہ طور پر.... جہاں تک میرا خیال ہے ایک بہت بڑے مجرم سے جانکر آیا تھا۔“

”یعنی....!“

”سردار صفدر سے۔“

”کس سے....؟“ فریدی کے لہجے میں حیرت تھی۔

”سردار صفدر سے۔“ حمید نے کہا اور پچھلی شام کی پوری روداد سنا کر بولا۔ ”میں دولت گنج

کے تھانے میں اتر گیا تھا اور وہ لوگ اسے اس کے کوارٹر تک پہنچانے چلے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے

کہ وہ ڈاکٹر.... سردار صفدر ہی تھا۔“

”ہو سکتا ہے تمہیں دھوکا ہوا ہو۔“ فریدی بولا۔ ”تم نے فائل میں صرف تصویر دیکھی تھی

یار پورٹ پڑھنے کی بھی زحمت گوارا کی تھی۔“

”نہیں میں نے رپورٹ نہیں پڑھی۔“

”آج سے چھ ماہ قبل سردار صفدر ایک حادثے کا شکار ہو کر مر چکا ہے۔“

”ہوگا! لیکن ان معاملات میں میری نظریں بہت کم دھوکا کھاتی ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر

اس تصویر سے ڈاڑھی نکال دی جائے تو اسی ڈاکٹر کا چہرہ برآمد ہوگا۔“

”ہوں.... لیکن وہ نرس....“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”کیا تم کل اُسے اس کے کوارٹر سے

لے گئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

”ظاہر ہے کہ وہاں کچھ لوگوں نے تمہیں اس کے ساتھ ضرور دیکھا ہوگا۔“

”یقیناً....!“

”چلو یہی اچھا ہوا کہ تم دولت گنج ہی میں اتر گئے تھے۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”وہ تمہارے متعلق سب کچھ جانتی رہی ہوگی۔“

”نہیں.... میں نے اُسے اپنا نام شاہد بتایا تھا۔“

”ہوں.... مگر تمہیں کبھی عقل نہ آئے گی۔“

حمید نے کوئی جواب نہ دیا۔ فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔

اگر تمہاری بات تسلیم کر بھی لی جائے تو یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ سارہ کے قتل میں انہیں لوگوں کا ہاتھ ہے۔“

”کسی طرح نہیں۔“

”پھر....؟“

”پھر یہ کہ.... میں سول ہسپتال جا رہا ہوں۔“

”دلغ خراب ہوا ہے۔“ فریدی اُسے گھورتا ہوا بولا۔ ”اگر کسی نے پہچان لیا تو زحمت میں پڑو گے۔“

”تو پھر آپ جائیے۔ میں نے اپنی زندگی کے چند بہترین لمحے اسکے ساتھ گزارے ہیں۔“

”آخری لمحہ بھی اُسی کے ساتھ گزارتے تو بہتر تھا۔“ فریدی ہونٹ سکڑ کر بولا۔

شہزادہ

تھوڑی دیر تک حمید پر بگڑتے رہنے کے بعد فریدی سول ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اُسے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔ سارہ کے کوارٹر کے سامنے خاصی بھیڑ تھی اور وہاں کھڑے ہوئے کا ٹنسیل بڑی دیر سے مجمع ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

”بہت اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔“ انسپکٹر جگدیش فریدی کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

”کیا کوئی خاص بات ہے۔“

”بہت ہی خاص.... قتل تو زیادہ الجھا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ مگر ٹھہریے! میرے ساتھ

آئیے.... لاش اس کمرے میں ہے۔“

جگدیش اُسے لاش والے کمرے میں لے گیا۔ اینگلو انڈین نرس فرش پر چپٹ پڑی تھی۔ کسی نے اس کا گلا گھونٹ کر خاتمہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ابھی تک لاش کے قریب ہی موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ موت پچھلی رات کو دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔

”دروازہ باہر سے بند تھا۔“ جگدیش نے فریدی کو بتایا۔

”ہوں....!“ فریدی نے بے خیالی میں سر ہلادیا۔ اُس کی نظریں اُس میز پر جمی ہوئی تھیں جس پر پچھلی رات کا کھانا چنا گیا تھا.... دو کرسیاں آٹنے سانے پڑی تھیں کھانا دو آدمیوں کا معلوم ہوتا تھا اور شاید اس میں سے کچھ بھی نہیں کھایا گیا تھا۔

”تمہارا اندازہ کیا ہے۔“ فریدی نے جگدیش کو مخاطب کیا۔

”قاتل.... مقتولہ کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہاں پچھلی رات کو غیر متوقع طور پر نہیں آیا تھا کیونکہ میز پر دو آدمیوں کا کھانا جیوں کا تیوں موجود ہے۔“

”قیاس غلط نہیں معلوم ہوتا۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”لیکن کھانے سے قبل ہی قاتل اس پر حملہ کر بیٹھا۔“ جگدیش نے کہا ”اور اسے ختم کرنے کے بعد چپ چاپ نکل گیا۔ مگر میں بڑی الجھن میں پڑ گیا ہوں۔“

”کیوں....!“ فریدی اُسے گھورنے لگا۔

”ادھر آئیے۔“ رمیش نے اُسے دوسرے کمرے میں چلنے کو کہا۔

اور پھر فریدی کو ایک تحریر خیز بات سے دوچار ہونا پڑا۔ اُس کے ہاتھ میں دو ٹائپ کئے ہوئے خطوط اور ایک تصویر تھی اور تصویر بھی کس کی؟ میاں حمید کی۔

”یہ ساری چیزیں مقتولہ کے بکس سے برآمد ہوئی ہیں۔“ جگدیش نے کہا۔

فریدی اُن دونوں خطوط کو پڑھ رہا تھا۔ ان میں حمید نے سارہ کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا تو میں تم دونوں کو قتل کر دوں گا۔ خطوط کے نیچے اُس نے اپنے پورے دستخط

فاؤنٹین پن سے کئے تھے اور نام کے ساتھ سر جٹ بھی لکھا تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ دونوں خطوط خود فریدی ہی کے رائیٹنگ پیڈ کے کاغذوں پر نائپ کئے گئے تھے۔

”اور سنئے۔“ جگدیش آہستہ سے بولا۔ ”کل دن کو یہ ایک آدمی کے ساتھ موٹر سائیکل پر کہیں گئی تھی۔ دیکھنے والوں نے اس آدمی کا جو حلیہ....!“

”وہ حلیہ بھی حمید ہی کا ہے۔“ فریدی پر سکون لہجے میں بولا۔

”جی ہاں.... میں بڑی الجھن میں پڑ گیا ہوں لیکن مقتولہ کی ساتھ والی نرسوں نے اس آدمی

کا نام شاہد بتایا تھا۔“

”ہوں.... کیا ان میں سے کسی کو یہ تصویر بھی دکھائی ہے۔“

”جی نہیں.... قطعی نہیں.... ان خطوط اور اس تصویر کا علم میرے علاوہ کسی اور کو نہیں۔“

”ٹھیک....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”ہاں تم نے مجھے کیا اسی لئے فون کیا تھا۔“

”جی نہیں! یہ چیزیں تو فون کرنے کے بعد برآمد ہوئی ہیں۔ دوبارہ آپ کو فون کرنے ہی

جار ہا تھا کہ آپ آگئے۔“

”میں ذرا ان نرسوں سے الگ الگ ملنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے اس کا نام شاہد بتایا ہے۔“

”میں بلواتا ہوں۔ سب میٹرن کے کوارٹر میں موجود ہیں۔“

فریدی وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جگدیش باہر جا چکا تھا اور فریدی متجسس نظروں سے

چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر پریشانی یا الجھن کے آثار قطعی نہ تھے اور نہ اُسے حمید

پر غصہ ہی آ رہا تھا۔ اسے اس پر بھی جھلٹ نہیں تھی کہ حمید نے ان خطوط کے لئے اُس کے پیڈ

کا کاغذ کیوں استعمال کیا جس پر اُس کا نام چھپا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جگدیش ایک نرس کے ساتھ واپس آیا۔

”تمہارا نام....!“ فریدی نے اُس سے پوچھا۔

”تیوڈورا۔“

”سارہ کو کب سے جانتی تھیں۔“

”جب سے یہاں آئی تھی۔“

”کب سے تھیں....!“

”چھ ماہ قبل...!“

”اس کے ملنے والوں سے بھی کچھ واقفیت رکھتی ہو۔“

”ہسپتال والوں کے علاوہ صرف ایک آدمی سے اس کے تعلقات تھے وہ بھی ابھی حال ہی کے تھے۔“

”کس سے۔“

”شاہد سے۔“

”وہ کہاں رہتا ہے۔“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اتنا بتا سکتی ہوں کہ میں نے آج تک شاہد کے علاوہ اسے اور کسی بیرونی آدمی کے ساتھ نہیں دیکھا۔“

”کیا وہ کل شاہد ہی کے ساتھ کہیں گئی تھی۔“

”جی ہاں۔“

”تم نے دیکھا تھا۔“

”جی ہاں۔“

”اور پھر وہ دونوں واپس آئے تھے۔“

”ان کی واپسی کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی۔“

پھر فریدی نے حمید کی تصویر جیب سے نکال کر اس کے سامنے ڈال دی۔

”اسے پہچانتی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

”اوہ! یہی تو وہ ہے شاہد۔“ وہ بے ساختہ بولی۔

”تمہیں کس نے بتایا تھا کہ اس کا نام شاہد ہے۔“

”خود سارہ نے۔“

فریدی نے یکے بعد دیگرے ان ساری نرسوں سے گفتگو کی جو حمید کو بحیثیت شاہد جانتی

تھیں۔ بہر حال اس کے علاوہ کوئی اور بات معلوم نہ ہو سکی کہ وہ شاہد کے متعلق صرف اتنا ہی

جانتی تھیں کہ اس کا نام شاہد ہے اور نام انہیں سارہ ہی نے معلوم ہوا تھا۔

”سارہ ان کے متعلق کچھ اور بھی کہا کرتی تھی۔“ فریدی نے ان سے پوچھا۔

پہلے اس نے انہیں فرداً فرداً الگ بلا کر سوالات کئے تھے اور اب وہ سب ایک ہی جگہ پر تھیں۔ اس کی اس بات کا جواب فوراً ہی نہیں ملا۔ اُن میں سے کبھی کے چہرے سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

”ایک بات....!“ ایک نرس بولی۔ ”غیب ہونے کی بناء پر مجھے اب تک یاد رہ گئی ہے ویسے اور کسی کا دھیان نہیں۔“

”کیا....؟“

ایک بار وہ باتوں کی رو میں کہہ گئی تھی کہ شاہد کی شخصیت پُر اسرار ہے جس دن اُس پر سہ پردہ اٹھے گا دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی۔

”اوہ....!“ فریدی پُر خیال انداز میں اُسے دیکھنے لگا۔ ”کچھ اور۔“

”اور.... کوئی خاص بات نہیں۔ ویسے وہ زیادہ تر اسی کی باتیں کیا کرتی تھی۔ برا خوش مزاج ہے۔ انتہائی ذہین، خوش سلیقہ اور مہذب وغیرہ وغیرہ۔“

فریدی نے انہیں رخصت کر دیا.... پھر وہ جگدیش کیٹرف مڑ کر بولا۔ ”برے پھنسے میاں حمید۔“

”تو کیا حمید نے.... واقعی....!“ جگدیش چونک کر بولا۔

”میرا یہ مطلب نہیں کہ حمید نے اسے قتل کیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بھلا حمید اور رقابت! یا اس کی محبت رقابت والی ہوتی ہی نہیں۔ وہ تو بس لڑکیوں کا ساتھ چاہتا ہے۔ افلاطونی عشق پر یقین نہیں رکھتا۔“

”اور یہ خطوط۔“

”خطوط....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ذرا یہ تو سوچو کہ جب اس نے مقتولہ کو اپنا نام شاہد بتایا

تھا تو پھر خطوط میں سرجنٹ حمید لکھنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر خطوط بھی کیسے قتل کی دھمکی والے۔

نہیں جگدیش صاحب! اگر وہ ایسا کرتا بھی تو کم از کم میرے رائٹنگ پیڈ کا کاغذ نہ استعمال کرتا۔“

”تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ حمید صاحب قاتل ہیں۔“ جگدیش جلدی سے بولا۔

”نہیں شبہ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور ہاں یہ بھی سنو کہ یہ دستخط حمید ہی

کے میں یا یوں سمجھو کہ بالکل ویسے ہی ہیں۔“

”تب تو....!“

”نہیں اس بناء پر بھی یقین نہیں کیا جاسکتا کہ یہ حمید ہی کی حرکت ہے۔ کیونکہ ہم آئے دن ایسے نقلی دستخطوں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔“

”لیکن ابھی اس نرس نے کہا تھا کہ سارہ نے شاہد کی پراسرار شخصیت کی طرف اشارہ کیا تھا۔“ جگدیش نے کہا۔

”ہاں یہ بات ضرور تشویش ناک ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاہد کی اصلیت سے واقف تھی بہر حال معاملہ پیچیدہ ہے۔“

”حمید صاحب ہیں کہاں۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”آفس میں۔“

جگدیش خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بوا۔

”آپ نے ان لوگوں کو تصویر کیوں دکھادی۔“

”میں یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ حمید بھی اس کیس میں مشتبہ حیثیت رکھتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”خیر تم تو ایک بار یہاں کی تلاشی لے ہی چکے ہو! ذرا میں بھی دیکھ لوں۔“

فریدی ایک ایک چیز کو بنظر غائر دیکھ رہا تھا۔ ایسے نشانات کی طرف سے تو اسے پہلے ہی مایوسی ہو چکی تھی، جو قاتل نے چھوڑے ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ قاتل نے ہاتھوں میں دستانے پہن کر سارہ کا گلا گھونٹا تھا لیکن اس بات پر حیرت ضرور تھی کہ پاس پڑوس والوں کو بھی اس حادثے کی خبر نہ ہوئی۔ سارہ ایک تندرست لڑکی تھی آسانی سے تو نہ مری ہوگی۔

اُس کی کتابوں کی الماری دیکھتے وقت فریدی کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ ایک ستھرے مذاق کی لڑکی تھی الماری میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں تھی جو کسی گھٹیا مصنف کی ہوتی فنش قسم کا امریکی لٹریچر بھی نہیں دکھائی دیا۔

اس تلاشی کے دوران میں صرف ایک چیز کام کی مل سکی۔ یہ سارہ کی ڈائری تھی اور پھر وہ اس کے اوراق الٹ پلٹ رہا تھا ایک جگہ شاہد کا نام دیکھ کر اُس کی دلچسپی بڑھ گئی۔

مقتولہ نے خالص رومانی انداز میں لکھا تھا۔

”کیا سچ مجھ میرے خواب حقیقت بن جائیں گے۔ میں بچپن ہی سے ایک ایسے شہزادے کے متعلق سوچتی آرہی ہوں جو مجھے اچانک مل جائے، مجھے چاہئے لگے لیکن ایک معمولی آدمی کی

حیثیت سے اور پھر اچانک یہ راز کھل جائے کہ وہ ایک شہزادہ ہے ہم دونوں حسین مرغزاروں میں ٹہلتے پھریں۔ بیکراں وسعتوں میں اکیلے ہوں۔ نیلا آسمان دور کی پہاڑیوں پر جھکا ہوا معلوم ہو اور پہاڑوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی قرمزی کر نیں ہو لے ہو لے ریگ رہی ہوں۔ ہمارے سروں پر قازوں کی لمبی سی قطار پرواز کر رہی ہو اور ہمارے پیروں کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس ہو۔ شہزادے کی پر خواب آنکھیں میری روح کی گہرائیوں میں جھانک رہی ہوں۔ پھر وہ میرے زانو پر سر رکھ کر سو جائے۔ کاش میرے خوابوں کی تعبیر سچ مجھے مل گئی ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ شاید شہزادہ ہے۔ اُس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتا ہے۔ مجھے اس کی شخصیت پر اسرار معلوم ہوتی ہے۔ میرا شہزادہ مجھے مل گیا ہے۔ میری حسین آرزو! شاید شہزادہ ہے۔ ایک دن یہ راز ضرور کھلے گا۔“

فریدی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا حمید اُسے یو قوف بنا رہا تھا۔ وہ کچھ بھی رہا ہو لیکن اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ سارہ اسے حمید کے نام سے نہیں جانتی تھی۔ فریدی نے پوری ڈائری دیکھ ڈالی۔ اس میں شاید کاتذکرہ کئی جگہ کیا گیا تھا لیکن حمید کی اصل حیثیت کے متعلق کہیں ہلکا سا اشارہ بھی نہ ملا۔

”اُسے بھی دیکھو....!“ فریدی نے وہ ڈائری جلد لیش کی طرف بڑھادی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ تک سکوت رہا۔ اس دوران میں جلد لیش ڈائری کی ورق گردانی کرتا رہا اور فریدی کی کمرؤں کی دوسری چیزیں التا پلٹا رہا۔

”بھئی کمال کر دیا حمید نے بھی۔“ جلد لیش آہستہ سے بڑھایا۔ ”شہزادے صاحب۔“

”تمہاری کھوپڑی الٹ گئی ہے۔“ فریدی بولا۔

جلد لیش استغہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ڈائری کی کسی تحریر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ شاید نے خود کو کسی شہزادے کی

حیثیت سے پیش کیا ہو۔ متقولہ خود اسے شہزادہ سمجھنے پر مصر دکھائی دیتی ہے کس بناء پر؟ ڈائری اس کا جواب نہیں دیتی۔“

”عجیب معاملہ ہے۔“ جلد لیش سر ہلا کر بولا۔

فریدی نے وہ ڈائری اُس سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لی۔ تصویر اور خطوط بھی اُسی کے

پاس تھے۔

”بڑی دلچسپ سازش ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”سازش....؟“ جگدیش چوٹ کر بولا۔

فریدی خاموش ہی رہا۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”رپورٹ میں کیا لکھ رہے ہو!“

”یہی تو سوچ رہا ہوں۔“ جگدیش فکر مندانہ انداز میں بولا۔ ”اس تصویر اور خطوط نے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔“

”نہایت آسان طریقہ۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”تصویر اور خطوط کا تذکرہ سرے سے کرو ہی نہیں۔“

”اور شاید....؟“

”شاید کا تذکرہ ضروری ہے اور اس کا بیان کیا ہوا حلیہ بھی لکھو۔“

”آپ نے تصویر انہیں ناحق دکھائی۔“

”اوہ.... چھوڑو.... یہ سب دیکھا جائے گا۔“

فریدی آفس واپس آگیا۔ حمید کمرے میں نہیں تھا وہ اور رمیش شاید چائے پینے کے لئے کینٹین میں چلے گئے تھے۔ فریدی اپنی میز پر بیٹھ کر کام میں مشغول ہو گیا اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی خاص بات ہوئی نہ ہو۔ کچھ دیر بعد حمید اور رمیش واپس آگئے۔

”اوہ شہزادے صاحب۔“ فریدی نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت

آمیز مسکراہٹ تھی۔ حمید نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔

”کسی نے گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالا۔“ فریدی نے رمیش سے کہا۔

”اچھا....!“

”کل وہ شاہد نامی ایک آدمی کے ساتھ کہیں گئی تھی۔ پولیس کا شبہ اسی پر ہے۔“

حمید چوٹ کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

”شاہد کے متعلق خیال کیا جا رہا ہے کہ اس نے سارہ کو اپنے متعلق دھوکے میں رکھا تھا۔“

”وہ کس طرح....!“ رمیش نے پوچھا۔

”اس نے مقتولہ سے کہہ رکھا تھا کہ وہ کسی ریاست کا شہزادہ ہے۔“
حمید کچھ بولنے کے لئے بے چین نظر آ رہا تھا۔ لیکن فریدی اُسے الجھن میں چھوڑ کر پھر کام میں مشغول ہو گیا۔
جیسے ہی رمیش باہر گیا حمید فریدی کے پاس آ بیٹھا۔ لیکن فریدی نے سر اٹھا کر دیکھنے تک کی زحمت گوراہ نہ کی۔

سونے کی خاک

”شہزادے والی بات کیا تھی۔“ حمید نے اکتا کر پوچھا۔
”کوئی خاص بات نہیں۔“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔ ”عورتوں کے پیچھے دوڑنے والے عموماً اسی قسم کی حرکتیں کیا کرتے ہیں۔“
”دیکھئے مجھے زیادہ الجھن میں نہ ڈالئے۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔
”اور میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اپنے چہرے پر قبرستانی فضا پیدا کرنے کی بجائے قہقہے لگائیے ورنہ.... یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شام کے اخبارات میں شاہد کا حلیہ شائع ہو جائے گا۔“
”مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“ حمید ہونٹ سکڑ کر بولا۔ ”شہزادے والی بات۔“
”بتا تو چکا کہ شاہد نے خود کو شہزادہ ظاہر کیا تھا۔“
”قطعاً.... غلط ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن شہزادے والی بات میں خود آج تک نہ سمجھ سکا۔“
”کیا مطلب....!“ فریدی چونک کر بولا۔

”وہ خود ہی اکثر مجھے پرنس کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی.... اور قطعاً سنجیدگی سے.... اکثر جھنجھلا کر یہ بھی کہہ بیٹھتی تھی کہ تم آخر خود کو چھپاتے کیوں ہو۔“
فریدی متحیرانہ انداز میں حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔
”تم نے اس سے شہزادہ سمجھنے کی وجہ نہیں پوچھی؟“
”اس کا اُس نے کبھی کوئی تشفی بخش جواب ہی نہیں دیا اور میں حقیقتاً ہی سمجھتا رہا کہ وہ مجھے بیوقوف بنا رہی ہے لیکن آپ کو اس کا علم کیونکر ہوا....؟“

”اس کی ڈائری سے.... لیکن اُس میں بھی اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔“

”عجیب معاملہ ہے۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔

”مگر بیٹے خاں تمہیں ایسی حرکت نہ کرنی چاہئے تھی۔“

”کیا....!“ حمید چونک کر بولا۔

”اُسے خط لکھنے کے لئے تمہیں میرے رائٹنگ پیڈ کا کاغذ نہ استعمال کرنا چاہئے تھا۔“

”خط....! میں نے آج تک اُسے کوئی خط لکھا ہی نہیں۔“

”تصویر دی تھی۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نے اُسے اپنی کوئی تصویر بھی نہیں دی۔“

”لیکن یہ دونوں چیزیں اس کے یہاں سے برآمد ہوئی ہیں۔“ فریدی نے تصویر اور خطوط

اُس کی طرف بڑھا دیئے۔

”خدا کی قسم....!“ حمید خطوط پڑھ کر بوکھلا گیا۔ ”مگر.... یہ دستخط بالکل ایسے ہی ہیں جیسے

میں کرتا ہوں۔“

”ممکن ہے شراب کے نشے میں کبھی لکھ کر بھول گئے ہو۔“ فریدی نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔

”کہہ لیجئے! اب تو الو بن ہی گیا ہوں۔“

فریدی چند لمحے اُسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”اس سے تم ملے کس طرح تھے؟“

”ہوٹل ڈی فرانس کے ایک رقص کے دوران میں وہ خود ہی میری طرف جھکی تھی۔“

”اس کے دوسرے دوست بھی رہے ہوں گے۔“

”مجھے اُن کے متعلق علم نہیں۔ اُس نے کبھی کسی کا تذکرہ نہیں کیا۔“

فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”اچھا گھامڑ خاں! مجھے ان لوگوں کے متعلق بتاؤ۔ جنہوں نے تمہیں شراب پلائی تھی۔“

”ان کے متعلق بھی آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔“

”تم نے اچانک ہی بالی کیپ کا پروگرام بنالیا تھا یا یہ بات پہلے ہی سے طے تھی۔“

”میں نے دو دن پہلے ہی سے طے کر رکھا تھا۔“

”خوب....!“ فریدی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”بہر حال وہ خود ہی تم پر عاشق ہو گئی تھی۔“
 ”میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”اوہ....!“ فریدی اپنی باتیں آنکھ دبا کر آہستہ سے بولا۔ ”تصور تمہارا نہیں تمہارے کٹیلے
 پن کا ہے۔“

حمید بھنا کر کھڑا ہو گیا۔

”میٹھو پیارے میٹھو! اس وقت تم میری مٹھی میں ہو۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں
 تمہیں نہایت آسانی سے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتا ہوں۔“

”ہو نہہ.... پھانسی....!“ حمید ہڈیانی انداز میں ہنس پڑا۔

”اس ہنسی میں دلیری کا اظہار ضرور ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”لیکن آج رات شاید ہی
 تمہیں سونا نصیب ہو سکے۔“

”سونا....!“ حمید زیر لب بڑبڑایا اور دفعتاً اس کے ذہن نے پچھلی شام کی دھندلی یادوں کی
 طرف جست لگائی۔ برائٹی کی بوشعور کی تہوں کو کلبلانے لگی اور پھر ذہن کے تاریک گوشوں
 میں سونے کا تصور جھلکیاں مارتا ہوا ابھرنے اور ڈوبنے لگا۔

”سونا.... سونا۔“ وہ مضطربانہ انداز میں میٹھ گیا۔

فریدی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔“

”شاید کچھ سونے کی بات تھی۔“ حمید اس طرح بولا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔

”ایکٹنگ اچھی کر لیتے ہو۔“ فریدی نے منہ بنا کر کہا۔ ”لیکن اس سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں

کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔“

”بند اسونے کی کچھ بات تھی۔“

”بکو مت....!“ فریدی بگڑ کر بولا۔

”میں نے کیا کیا.... میں نے کیا کیا۔“ حمید بے چینی سے ہاتھ مل رہا تھا۔

”تو کیا چچ تمہیں نے۔“ دفعتاً فریدی کے چہرے پر سراپیمگی کے آثار پیدا ہو گئے۔

”کیا چچ....؟“ حمید اسے گھورنے لگا۔

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“

”خراب نہیں ہوا تو اب ہو جائے گا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔“

”اے اودگدھے کچھ بولے گا بھی یا پیلیاں ہی بجھاتا رہے گا۔“

”میں نے نشے میں دلاور نگر سے لائے جانے والے سونے کا راز ظاہر کر دیا ہے۔“

”کیوں.....؟ کس طرح.....!“

”میں نشے میں تھا۔“

”کتنی بار کہو گے کہ تم نشے میں تھے۔“ فریدی جھنجھلا گیا۔

”سنئے تو سہی..... نشے کی ترنگ تو آپ جانتے ہی ہیں۔“

”اے اچھی طرح جانتا ہوں..... تم بک بھی چکو۔“

”وہ غالباً گورنمنٹ کی پالیسیوں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں مثال کے طور پر یہ بات بتائی کہ دلاور نگر سے لائے جانے والے سونے کی روانگی کی تاریخ سے عوام واقف نہیں ہوں گے۔ لیکن بہتوں کو یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ دلاور نگر سے سونا آنے والا ہے۔ میں نشے میں تو تھا ہی۔ اس بات پر میں نے ڈاکٹر کو لاکار دیا کہ میں تاریخ ہی نہیں بلکہ اس گاڑی کے متعلق بھی بتا سکتا ہوں جس سے سونا لایا جائے گا۔“

”خوب.....!“ فریدی توجہ سے سن رہا تھا۔

”پھر میں نے انہیں اُس کے متعلق بتا دیا۔“

”کیا بتایا۔“

”تیرہ تاریخ کو سترہ ڈاؤن سے۔“

”تمہیں سو فیصد یقین ہے کہ تم نے یہی بتایا تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں..... کیا میں نے غلط بتایا۔“

”قطعی غلط بتا دیا۔ وہ سترہ تاریخ اور تیرہ ڈاؤن ہے۔“

”تب تو بڑا اچھا ہوا۔“

”کیا اچھا ہوا؟“

”یہی کہ سچ مچ میں نے انہیں دھوکا دے دیا۔“

”اپنی خیر مناد بیٹے۔“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔ ”بلکہ خیر منانے سے بہتر تو یہ ہوگا کہ تم اُن لوگوں کو تلاش کرو۔“

حمید کچھ نہ بولا اور فریدی بھی خیالات میں ڈوب گیا۔ اُس کا ذہن بڑی تیزی سے مختلف وقعوں پر جست لگا رہا تھا۔

”تمہیں یقین ہے کہ وہ سردار صفدر ہی تھا۔“ اس نے تھوڑی دیر بعد حمید سے پوچھا۔

”مجھے سو فیصدی یقین ہے لیکن اب اُس کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں ہے۔“

”ہوں....!“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”حمید صاحب! اچھا ہی ہوا کہ یہ

بات آپ کو یاد آگئی ورنہ بہت سادقت بیکار ضائع ہوتا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”اگر واقعی تم نے اُسے قتل نہیں کیا تو کوئی اور کسی دوسرے اہم مسئلے سے وقتی طور پر ہماری

توجہ ہٹانا چاہئے۔“

”سازش....!“ حمید آہستہ سے بڑبڑایا۔

”یا پھر یہ کہ ہمارا کوئی دشمن ہی ہمیں تنگ کرنا چاہتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”لیکن نہیں! مجھے پہلے ہی خیال پر زور دینا چاہئے کیونکہ سونے والی بات محض اتفاقیہ نہیں

معلوم ہوتی۔“

”تو آپ کا یہ خیال ہے کہ تیرہ ڈاؤن پر ڈاکہ پڑے گا۔“

”ڈاکہ....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا تمہیں وہ ڈاکہ یاد نہیں جو آج سے دو ماہ قبل نو

ڈاؤن پر پڑا تھا۔“

”مگر! میرے خیال سے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔“ حمید نے کہا۔

”ٹھیک ہے.... لیکن اُس ٹرین سے بھی وافر مقدار میں سونا آ رہا تھا۔“

”ہاں.... مجھے یاد ہے! ڈاکہ ڈالنے والے ناکام رہے تھے۔“

”تم انہیں ناکام سمجھتے ہو۔“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”کیوں؟ کیا سونا محفوظ نہیں رہا تھا؟ میرا خیال ہے کہ مسافروں کا بھی کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔“

”لیکن فرزند تم نے کب سے اخبار نہیں دیکھا....؟“

”کیوں....؟“

”وہ سارا سونا خاک ہو گیا۔“

”کب؟ کس طرح؟“

”کل کا اخبار دیکھا تھا۔“

”نہیں....!“

”ہاں کل تو تم بالی کیپ کی سیر کر رہے تھے۔“

”سونا خاک کس طرح ہو گیا۔“

”آزاد بینک کا ڈیڑھ من سونا خاک ہو گیا اور یہ وہی سونا تھا جو اُسی ٹو ڈاؤن سے آیا تھا جس پر

ڈاکہ پڑا تھا۔“

”رکھے ہی رکھے خاک ہو گیا۔“

”نہیں! اُسے اینٹوں کی شکل میں ڈھالنے کے لئے پگھلانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ۰۰

پگھلنے کی بجائے خاک ہو گیا۔“

”ڈیڑھ من سونا۔“ حمید آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

”جناب! اور آپ نے دلاور نگر سے آنے والے سونے کی بھی مٹی پلید فرمانے کی کوشش

فرمائی۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میں آپ کو مطلب سمجھانے کے لئے نہیں پیدا ہوا۔“ فریدی منہ سکڑ کر بولا۔

”میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔“

”لیکن خواہ مخواہ بچہ بننے کی خواہش بھی پریشان کئے رہتی ہے۔“

”یہ بات نہیں جب آپ کوئی بات سمجھانے لگتے ہیں تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔“

”چاپلوسی بند حمید صاحب! میں آپ کو پھانسی سے نہیں بچا سکوں گا۔“

”پھانسی کی....!“ حمید جھنجھلا کر گالی بکتے بکتے رہ گیا۔

”پھانسی کی تو ہیں نہ کرو کہیں اُسے سچ مچ غصہ نہ آجائے۔“

”فریدی صاحب! میں موت سے نہیں ڈرتا۔“

”جیتے رہو فرزند! کسی عورت کو قتل کر دینے کے بعد جو انرد ہی ایسی باتیں کیا کرتے ہیں۔“

حمید نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا اور اٹھ کر اپنی ڈسک پر چلا گیا۔

”بیکار! تمہاری جھلاہٹ تمہیں بے گناہ نہیں ثابت کر سکتی۔ شہزادے صاحب۔“ فریدی

ہنس کر بولا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر فریدی بولا۔

”ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست لکھو۔“

”کیوں....؟“

”جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔“

حمید درخواست لکھنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اُس نے وہ کاغذ فریدی کی طرف بڑھادیا۔

فریدی نے درخواست لے کر رکھ لی اور بولا۔

”اب چپ چاپ گھر چلے جاؤ۔“

حمید چند لمحے کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

”کیا تم نے سنا نہیں۔“ فریدی سر جھکائے ہوئے بولا۔

”حمید نے بے چوں و چرا موثر سائیکل اٹھائی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ اُس کے ذہن پر سارہ

چھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ اُس نے اس کی لاش نہیں دیکھی تھی لیکن پھر بھی تصور کی آنکھ اُس کے

شوخی چہرے پر غبار آلود چادر دیکھ رہی تھی۔ خفیف سے کھلے ہوئے نرم و نازک ہونٹ جو عموماً

خاموشی کی حالت میں کھل جاتے تھے۔ دھندلائی ہوئی آنکھیں۔ وہ آنکھیں، جو سردی کی ہلکی سی لہر

پر بھی جگمگا اٹھتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ.... اگر وہ لوگ سازشی ہی تھے تو انہوں نے اُسے کیوں مار

ڈالا۔ اگر وہ اُس کے گروہ سے تعلق رکھتی تھی تب بھی اُسے مار ڈالنے کی وجہ؟ پھر اُسے پچھلی

باتیں یاد آگئیں.... آخر وہ اُسے کسی ریاست کا پرنس سمجھنے پر کیوں مصر تھی.... ممکن ہے یہ بھی

چال رہی ہو! لیکن.... اگر چال تھی تو اُس نے اس کے متعلق ڈائری میں کیوں لکھا؟“

وہ اُن دونوں خطوط کے متعلق بھی سوچ رہا تھا آخر فریدی کے پیڈ کے کاغذ کیونکر حاصل

کئے گئے ہوں گے۔ کیا کوئی نوکر بھی اس سازش میں شریک ہے؟ پھر اس کے خیال کی روسو نے

والے معاملے کی طرف مڑ گئی۔ فریدی کے گفتگو کے انداز سے اس نے یہ مطلب اخذ کیا تھا کہ ٹرین پر ڈاکہ ڈالنے والوں نے شاید اصل سونے کی جگہ ایسا سونا رکھ دیا تھا جو حدت سے پکھلنے کی بجائے خاک ہو جانے کی خاصیت رکھتا تھا۔

پھر ایک نیا خیال اس کے ذہن میں ابھرا۔ کہیں یہ سب کچھ اسی لئے تو نہیں کیا گیا کہ فریدی اس قتل میں الجھ جائے اور سازشی اپنی مقصد براری میں مصروف رہیں۔۔۔۔۔ وہ سوچتا رہا لیکن شہزادے والا معاملہ اس دھانچے کے کسی خانے میں فٹ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس کیس میں بری طرح پھنس گیا۔ البتہ ان دونوں خطوط کی موجودگی اُسے تھوڑا بہت اطمینان دل رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ دستخطوں کے ماہر اصل اور نقل میں بہ آسانی فرق ڈھونڈ لیں گے۔ اس کی دانست میں سازشیوں نے خطوط کا اضافہ کر کے ایک زبردست غلطی کی تھی! اگر کہیں انہوں نے صرف تصویر ہی پر قناعت کی ہوتی تو اس کی گلو خلاصی مشکل ہی تھی۔ حمید کی موٹر سائیکل سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔ بس وہ غیر ارادی طور پر مختلف موٹروں پر اُس کا رخ پھیرتا جا رہا تھا۔ ویسے وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اُسے گھر جانا ہے یا کہیں اور۔۔۔۔۔!“

کوؤں کے شکاری

اُسی شام کو کرنل فریدی حمید کے ہونٹوں اور ناک کے نتھنوں کی مرمت کر رہا تھا۔ حمید نے بڑی دیر سے اپنی کھانسی تک روک رکھی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک عمل جاری رہا۔ پھر فریدی نے اس کے سامنے آئینہ رکھ دیا اور حمید اپنی ہنسی کسی طرح نہ روک سکا۔ ہونٹ کافی موٹے نظر آرہے تھے اور نتھنے پھولے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اُس پر سرخی بھی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شدید نزلے کی شکایت کی بناء پر اُس نے بار بار رومال استعمال کیا ہو۔

”بس اب بالکل ٹھیک ہے۔“ فریدی بولا۔ ”ہونٹوں اور نتھنوں پر تیل کی قسم کی کوئی چیز نہ

لگنے دینا۔ یہ میک اپ مہینوں کے لئے کافی ہے۔“

”بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔“

”اسی لئے کہتا ہوں فرزند کہ عورت کا چکر برا ہوتا ہے۔“ فریدی ہنس کر بولا۔

”واقعی بُرا ہوتا ہے.... اب دیکھئے ناکہ عورت ہی کے چکروں میں پڑ کر ہم دونوں پیدا ہو گئے۔“

فریدی نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ یہ نہیں کہ وہ اس جملے پر جھینپ گیا تھا یا اس تذکرہ ہی کو نالنا چاہتا تھا۔

”لیکن مجھے کب تک اس طرح رہنا ہو گا۔“ حمید نے پوچھا۔

”جب تک کہ معاملات صاف نہ ہو جائیں۔“

”مگر اس طرح تو میں اور زیادہ مشکوک ہو جاؤں گا۔“

”اس کی پرواہ نہ کرو۔“ فریدی شانوں کو جنبش دے کر بولا۔ ”میرا دعویٰ ہے کہ تم حشر تک

نہ پہنچانے جاسکو گے۔ اک ذرا تاریک شیشوں کی عینک لگائے رہا کرتا۔“

”لیکن میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔“

فریدی اُسے گھورنے لگا۔

”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میری بے عزتی ہو۔“ اس نے کہا۔

”بے عزتی کیوں؟“

”اگر تمہیں ایک گھنٹے کے لئے بھی حوالات دیکھنی پڑی تو میرے لئے ڈوب مرنے کا مقام

ہو گا۔“

”آخر آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ میں پکڑ ہی لیا جاؤں گا۔“

”یہ بھی کوئی پیچیدہ بات ہے؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ”تم نہایت آسانی سے پکڑ لئے

جاؤ گے؟ کیا تم یہ بھول گئے کہ تم نے واقعی اسے قتل نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ تمہیں

پھسانے ہی کے لئے کیا گیا ہے جو لوگ میرے رائٹنگ پیڈ کا کاغذ حاصل کر سکتے ہیں، جو تمہارے

دستخط بنا سکتے ہیں کیا وہ تمہیں حوالات تک پہنچانے کے لئے کوئی چال نہ چلیں گے۔ شام کے ایک

اخبار میں مقتولہ کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ اگر فرض کرو ان آدمیوں میں سے کوئی پولیس کو یہ

اطلاع دے دیتا ہے کہ اس نے پچھلی شام کو اسی شکل و صورت کی لڑکی کو تمہارے محلے کے ایک

آدمی کے ساتھ دیکھا تھا تو پھر تم کہاں ہو گے۔ مزید شہادت کے لئے وہ کسی نہ کسی سارہ کے

ساتھ والی نرسوں کو بھی پیش کر سکتے ہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ جو کچھ میں کہوں چپ چاپ

کرتے چلو! تم یہ بھی جانتے ہو کہ ڈی۔ ایس۔ پی سٹی سے میرے تعلقات اچھے نہیں۔“
ابھی شاید فریدی نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ بیرونی برآمدے میں کئی قدموں کی
آہٹیں سنائی دیں اور دوسرے ہی لمحے میں ڈی۔ ایس۔ پی سٹی دو سب انسپکٹروں اور تین کانسیلوں
سمیت ان دونوں کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے چاروں طرف دیکھا۔

”سر جنٹ حمید کہاں ہے۔“ اس نے فریدی کو مخاطب کیا۔

”وہ تو بعد کو بتاؤں گا۔“ فریدی جھنجھلا کر بولا۔ ”آپ یہ بتائیے کہ اس کمرے تک کس طرح پہنچے۔“

”میں سر جنٹ حمید کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔“

”میں آپ کو شریفوں کی طرح رہنے کا سلیقہ سکھانے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔“

”کیا مطلب....؟“

”کسی کے گھر داخل ہونے کا یہ طریقہ نہیں۔“

”آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟“ ڈی۔ ایس۔ پی بگڑ کر بولا۔

”ایک قانون شکن سے جو خود کو قانون کا محافظ کہتا ہے۔“

ڈی۔ ایس۔ پی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غصے کی بات بھی تھی۔ فریدی نے اُس کے ماتحتوں کے
سامنے اُسے اُدھڑ کر رکھ دیا تھا وہ اندر ہی اندر بُری طرح کھول رہا تھا اور فریدی یہ سوچ رہا تھا کہ
اس کی محنت جو اس نے حمید کے میک اپ پر صرف کی ہے بیکار نہیں گئی۔ حمید نے بھی اپنے
چہرے پر تئیر کے آثار پیدا کر لئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس غیر متوقع گفتگو پر شدت
سے متحیر ہو۔

”میں پوچھ رہا ہوں کہ سر جنٹ حمید کہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم! لیکن یہ طریقہ....!“

”طریقے دہرائیے کوئی الحال الگ رکھئے۔“ ڈی۔ ایس۔ پی سرد لہجے میں بولا۔ ”میرے پاس

اس کا وارنٹ گرفتاری ہے۔“

”کیا....؟“ فریدی چونک کر بولا۔ ”کیوں؟“

”ایک نرس کے سلسلے میں اُسے مشتبہ سمجھا گیا ہے۔“

”اوہ.... لیکن....؟“ فریدی کچھ کہتے کہتے رک گیا! آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے

جھنجھلاہٹ کے آثار غائب ہوتے جا رہے تھے اور ڈی۔ ایس۔ پی کے ہونٹوں پر ایک تشنہ آمیز مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

”کیا آپ صبح موقع واردات پر نہیں تھے؟“

”تھا کیوں نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن حمید....!“

”کیا نرسوں نے آپ ہی کے سامنے شاہد کا حلیہ نہیں بیان کیا تھا۔“

”کیا تو تھا.... لیکن.... محض اس بناء پر حمید ہی کیوں.... لیکن ٹھہرئیے۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ اُس کے ماتھے پر لکیریں ابھر آئی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ

کسی الجھن میں ہو۔ ڈی۔ ایس۔ پی اُسے گھور تارہا پھر چند لمحوں کے بعد بولا۔

”میرے پاس وقت کم ہے۔“

”بات یہ ہے کہ میں بھی فکر میں پڑ گیا ہوں۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ آج دوپہر کو

ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست میرے حوالے کر کے سعید آباد چلا گیا ہے۔“

”کیوں....؟“

”اُس نے تو مجھ سے یہ کہا تھا کہ وہاں اس کا کوئی قریبی عزیز سخت بیمار ہے۔“

”ہوں.... عزیز کا پتہ۔“

”پتہ اُس نے نہیں بتایا۔“

ڈی۔ ایس۔ پی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

”میں اس گھر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔“ اُس نے کہا۔

”شوق سے.... لیکن ہر کام قانون کے اندر رہ کر ہو گا۔“ فریدی بولا۔

”یعنی....!“

”تلاشی کا وارنٹ دکھائیے۔ دو گواہوں کی بھی ضرورت پیش آئے گی.... اور آپ تو خیر

اپنی جامہ تلاشی کی اجازت تو دے ہی دیں گے۔“

”سب کچھ ہو جائے گا۔“ ڈی۔ ایس۔ پی غرایا۔

ایک سب انسپکٹر فریدی کے دو پڑوسیوں کو بلالایا۔ پھر دوسری کاروائیوں کے بعد

ڈی۔ ایس۔ پی تلاشی شروع کرنے ہی جا رہا تھا تو فریدی نے اُسے روک کر کہا۔

”ٹھہریے! ایک بنیادی غلطی کی تلافی کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس وقت تلاشی قطعی غیر قانونی سمجھی جائے گی۔“

”کیا مطلب....!“

”آپ لوگ میری نادانستگی میں اندر داخل ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے آتے وقت خود ہی کوئی مشتبہ چیز کہیں ڈال دی ہو تو۔“

”آپ عجیب آدمی ہیں۔“ ڈی۔ ایس۔ پی جھنجھلا کر بولا۔

”قاعدے کی بات میں نے کہہ دی۔ اب جیسا آپ کا دل چاہے....!“

”آپ سرکاری کام میں حارج ہو رہے ہیں۔“

”جی نہیں! میں نے صرف ایک قانونی نکتہ آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں ضرور تلاشی لوں گا۔“ ڈی۔ ایس۔ پی پیرخ کر بولا۔

”یوں تو آپ اس عمارت میں آگ بھی لگا سکتے ہیں.... حاکم ٹھہرے۔“

”مسٹر فریدی آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔“

”جی نہیں میں آپ کو بھی حد ہی میں رکھنا چاہتا ہوں۔“

”تلاشی لی جائے گی۔“ ڈی۔ ایس۔ پی نے غصیلی آواز میں کہا۔

”میں آپ کو روکتا تو نہیں۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا اور سگار سلگانے لگا۔

دو گھنٹے کی عرق ریزیوں کے باوجود بھی ڈی۔ ایس۔ پی کوئی ایسی چیز برآمد نہ کر سکا جس کی

بناء پر حمید قانون کی مزید گرفت میں آسکتا۔

وہ تھک ہار کر پھر اسی کمرے میں آگیا جس میں اُس نے فریدی اور حمید کو چھوڑا تھا۔

اگر آپ رات کو کھانا میرے ہی ساتھ کھائیں تو مجھے خوشی ہوگی۔“ فریدی نے اس سے کہا۔

”جی نہیں شکریہ۔“ ڈی۔ ایس۔ پی نے ہونٹ سکڑ کر کہا اور عمارت میں اپنے وزنی جوتوں

کی گونج پیدا کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ دونوں گواہ بھی پولیس والوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے تھے۔

”کیوں! حمید صاحب! اب کیا خیال ہے۔“ فریدی اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”خدا کی قسم اگر آپ کا تعلق سٹیج سے ہوتا تو سارے ملک میں آپ کی اداکاری کا ڈنکا بج جاتا۔“

”اسٹیج پر ڈنکا نہیں طبلہ بجتا ہے.... اب چھوڑو یہ باتیں۔ ہوٹل ڈی فرانس میں تمہارے لئے انتظام کر دیا گیا ہے.... دفع ہو جاؤ۔“
 ”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن....!“

”عجیب آدمی ہو.... میں کہتا ہوں اب چپ چاپ چل دو۔ ہوٹل ڈی فرانس میں کمرہ نمبر تیرہ۔ تمہارا نام سعید جو ہے اور تم ایک کشمیری سیاح ہو۔ کشمیر میں تمہاری جاگیر ہے۔“
 ”اور میں عموماً جاگیر ہی میں انڈے دے دیا کرتا ہوں۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔
 ”تم یہ مت سمجھو کہ تمہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑے گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس ایک ماہ کی چھٹی کے منٹ منٹ کا حساب لے لوں گا۔“
 ”یعنی....!“

”تمہیں اُن چار شکاریوں پر نظر رکھنی ہے۔“
 ”کون سے چار شکاری۔“
 ”وہی، جو شہر میں کوئے مارتے پھرتے ہیں۔“
 ”اور میں اُن کے پیچھے کھیاں مارتا پھروں گا۔“
 ”اگر نہیں پھرو گے تو پھر پھانسی کا تختہ....!“
 ”کیا مطلب.... بھلا ان کا اس معاملے سے کیا سروکار۔“
 ”ایک شبہ ہے۔“
 ”کیا....!“

”تم جانتے ہو کہ ابھی میں اس کا اظہار نہیں کروں گا۔“
 ”چلے! میں پوچھتا ہی نہیں۔“ حمید بولا۔ ”ویسے میں خود انہیں اور ان کی کمپنی کو سرے سے بندل سمجھتا ہوں۔“
 ”کیوں....؟“

”اگر میں فی الحال بتانا مناسب نہ سمجھوں تو!“ حمید نے فریدی کے لہجے کی نقل اتاری۔
 ”انہوں نے شہر میں کوئے مارنے کا اجازت نامہ بلدیہ سے حاصل کیا ہے۔“ فریدی بولا۔
 ”مجھے ایسے اجازت ناموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حکومت نے ایک بار ان دو ڈاکٹروں کی

بھی تو مدد کی تھی جو آدمی کو کتوں کی سی قوت عطا کر دینے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کیا یہ نیاز ہو گیا بھی اسی قسم کا نہیں ہے۔ ہونہ کوے کے پروں سے کاغذ بنائیں گے۔ بھلا وہ کاغذ کس کام آئے گا۔“ وہ بیک وقت کاغذ بھی ہو گا اور کپڑا بھی۔ اُس سے نہایت عمدہ قسم کے پیراشوٹ بنائے جاسکیں گے۔“

”اور وہ پیراشوٹ!“ حمید ہنس کر بولا۔ ”ہوا بازوں کو نیچے لانے کی بجائے اوپر لے جائیں گے۔“

”اچھا تو تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔“

”جی نہیں! میں نہایت سنجیدگی سے عرض کر رہا ہوں۔“

اسے سارہ کی موت یاد آگئی اور اس پر پھر پہلے سی دل گرفتگی کے آثار طاری ہونے لگے مگر یہ سوال اب بھی اُس کے ذہن میں چبھ رہا تھا کہ ان شکاریوں سے اس معاملے کا کیا تعلق؟ فریدی سے اُس کی توقع نہیں تھی کہ وہ بات کو اسی وقت صاف کر دے گا۔ بہر حال اُس نے سنجیدگی سے اس مسئلے کو کریدنا شروع کر دیا۔

”ذرا یہ تو سوچئے کہ وہ کاغذ یا کپڑا مہنگا کس قدر پڑے گا۔“

”مہنگا.... بھلا مہنگا کیوں پڑے گا۔“ فریدی نے کہا۔

”کمال کرتے ہیں آپ بھی، کیا آپ کی نظر کار تو سوں کی گرانی پر نہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی فائر میں ایک کو ابھی مار لیں! لہذا یہ کتنا مہنگا پڑے گا یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔“

فریدی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

حمید اس مسئلے پر اپنے نکتہ نظر سے کچھ اور بھی روشنی ڈالنا چاہتا تھا فریدی کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”کوئے کا شکار آسان نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں کوشش کروں تو پانچ چھ کار تو س برباد کرنے کے بعد بھی شاید کامیاب نہ ہو سکوں۔“

”خیر وہ تمہاری طرح احمق نہیں ہیں۔ اگر وہ بد وقت ہی سے کوؤں کا شکار کرتے ہوتے تو میں انہیں پاگل خانے بھجوا دیتا۔“ فریدی نے کہا۔

”پھر....؟“

”کیا کبھی شکار کے دوران میں تمہیں کوؤں کے جھنڈ کا سامنا کرنا پڑا۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”میاں صاحب زادے! جہاں تم نے ایک فائر کیا! کوئے تمہارے ساتھ ہو لئے وہ آگے آگے اور تم ان کے پیچھے بعض اوقات تو کم بخت چیچ چیچ کر شکار کا سارا مزہ کر ادیتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل کوؤں کی اسی عادت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جہاں انہوں نے بستی میں دو ایک فائر کئے ان کے ساتھ ہو لئے۔ اس طرح یہ لوگ ان کوؤں کو بستی کے باہر ایک جگہ ہنکالے جاتے ہیں جہاں انہوں نے پہلے ہی سے بڑے بڑے جال لگائے ہیں وہ دراصل کوئے پھنساتے ہیں مارتے نہیں! میڈیٹل ایریا میں ہندو قتلانا منع ہے اسلئے انہوں نے خاص طور پر اجازت نامہ حاصل کیا ہے۔“

”لیکن سارہ کے قتل سے ان کا کیا تعلق ہے۔“ حمید نے جلدی سے پوچھا۔ مگر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا شاید فریدی باتوں کی رو میں کچھ نہ کچھ ضرور اگل دے گا۔

”ایک بار کہہ دیا کہ میں ابھی اسے واضح نہیں کرنا چاہتا کیونکہ فی الحال میں قیاسات ہی کے اسٹیج میں ہوں۔“

”چلئے قیاس ہی سہی۔“ حمید بولا۔

”فضول ہے۔“ فریدی نے سگڑ ساگاتے ہوئے کہا۔ ”اب جاؤ۔“

حمید ہوٹل ڈی فرانس کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستہ بھر اس کا ذہن ان شکاریوں اور ان کی کمپنی میں الجھا رہا، جو ایک نئی ایجاد کے سلسلے میں حکومت اور عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چاروں شکاری بجائے خود اپنی کمپنی کی اچھی خاصی پیلٹی تھے جس وقت وہ اعلیٰ قسم کے شکاری سوٹ میں ملبوس کاندھوں پر ہندو قیں لٹکائے شہر میں داخل ہوئے تو ان کے گرد اچھی خاصی بھیڑ لگ جاتی۔ وہ چاروں کافی وجیہ اور مضبوط ہاتھ پیر والے تھے۔ تعلیم یافتہ بھی معلوم ہوتے تھے۔ عوام سے گفتگو کرتے وقت ان کے لہجوں میں حد درجہ شائستگی اور ملائیت ہوتی تھی۔ کالجوں کے بعض مچھلے طلباء انہیں راہ چلتے روک کر کسی قریبی ریستوران میں چائے کے لئے مدعو کرتے اور وہ ان کی دعوت خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے اور پھر چائے کے دوران میں اپنی کمپنی کی اسکیم کی تفصیلات کے بارے میں بتاتے۔ شروع شروع میں محکمہ سراغ رسانی کے بعض افراد نے انہیں شک کی نظروں سے دیکھا تھا لیکن آخر کار انہیں بھی اپنی رائے بدل دینی پڑی۔ اخبارات نے بھی ان کے متعلق بہت کچھ لکھا تھا۔ کسی نے اس اسکیم کا مضحکہ اڑایا تھا اور کسی نے اسے ”ترقی کی طرف ایک اور قدم“ سے تعبیر کیا تھا۔ بہر حال جتنے منہ اتنی باتیں۔ البتہ حکومت

کی امداد کا انحصار اسکیم کی کامیابی پر تھا۔

جھڑپ

دوسرے دن کے اخبارات میں حمید کی فراری کا حال بڑی بڑی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ بات معمولی نہیں تھی۔ ایک ایسے آدمی پر قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا جس نے قانون کی محافظت کے سلسلے میں کئی بار موت کا سامنا کیا تھا۔

ایک اخبار میں حمید اور سارہ کی تصاویر بھی چھپی تھیں۔ حمید نے جب یہ تصویریں دیکھیں تو سکتے میں آگیا۔ اُسے کوئی ایسا موقع یاد نہ آیا جب اُس نے سارہ کے ساتھ کوئی تصویر کھنچوائی ہو۔ تصویر کھنچوانے کے مسئلے پر وہ ہمیشہ بدکرتار ہوتا تھا۔ اس نے آج تک کسی عورت کے ساتھ تصویر نہیں کھنچوائی تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر اُسے سچ مچ یقین آگیا کہ سارہ سازیوں سے ملی ہوئی تھی.... کیا وہ خود بھی اُس سازش سے بے خبر تھی۔ کیا اُن سازیوں نے محض سونے کی روانگی کے بعد اُسے اس لئے قتل کر دیا کہ کہیں یہ بات ظاہر نہ ہو جائے۔

حمید انہیں خیالات میں الجھا ہوا سڑکیں ناپ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ پبلک میں اپنے متعلق چہ میگوئیاں بھی سنتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ تو اُسے میساختہ ہنسی آگئی۔ ایک صاحب ایک مجمع میں فرما رہے تھے۔ ”ارے صاحب میرے خیال سے تو وہ جاسوس بھی کوئی ڈاکو ہی تھا۔ ارے آپ بہتے ہیں.... جناب والا.... کیا نام تھا اس کا.... بہرام ڈاکو.... بہرام ڈاکو ہمیشہ پولیس آفیسر کے بھیس میں رہا کرتا تھا.... اس کی اصلی صورت سے کوئی واقف ہی نہیں تھا۔“

اس پر ایک طالب علم ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ ”بہرام کا وجود نہیں تھا.... بہرام دراصل لیبلانک کے ناولوں کے ایک ڈاکو آر سین لوپن کا اردو ترجمہ ہے۔“

وہ صاحب بگڑ کر بولے۔ ”چلئے یہ ایک ہی رہی۔ آپ بچے ہیں کیا جانیں میاں میں نے اپنے دادا کی زبانی سنا تھا! اُن سے بہرام کا بڑا یار نہ تھا۔ وہ دلی میں کو توالت تھے۔ آپ شاید یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ بہرام تھا کون۔ کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ خیر تمہیں تو یہ بھی ہوائی ہی معلوم ہوگی۔ یہ تمہارا نہیں انگریزی تعلیم کا قصور ہے۔ بہرام دراصل بہادر شاہ ظفر کا پڑپوتا تھا۔ انگریزوں سے

انتقام لینے کے لئے ڈاکو بن گیا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ خود بہادر شاہ ظفر ہی بہرام تخلص کرتے تھے۔“ طالب علم نے ہنس کر کہا۔
حمید دل ہی دل میں قہقہے لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ اس وقت دراصل اُن چاروں شکاریوں کی تلاش میں نکلا تھا۔ اس نے آج تک فریدی کے قیاسات کو قیاسات ہی کی حدود میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے شبہات عموماً حقیقت ہی ثابت ہوئے تھے۔

دفعۃً اُسے کوؤں کا شور سنائی دیا! بیشار کوئے فضا میں منڈلا رہے تھے وہ سب ایک عمارت پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد شکاری دکھائی دیئے۔ اُن میں سے ایک نے فائر کیا۔ کوئے پھر شور مچاتے ہوئے اڑے۔ حمید بھی ان دونوں کے پیچھے ہو لیا۔ کوئے تھوڑی دور اڑنے کے بعد کسی عمارت یا درخت پر بیٹھ جاتے تھے اور جیسے ہی وہ دونوں شکاری اُن کے نزدیک پہنچتے پھر اڑ کر شور مچانے لگتے تھے۔ اس طرح وہ شکاری انہیں بستی کے باہر نکال لائے۔

یہاں پہنچ کر ان شکاریوں نے اپنی بندوقیں جھاڑیوں میں ڈال دیں اور خود ایک سائے دار درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ انہوں نے حمید کو دیکھ لیا تھا اور ان کے چروں پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسی کسی ایسے میزبان کے چہرے پر ہوتی ہے جو ایک معزز مہمان کے استقبال کا شرف حاصل کر رہا ہو۔

حمید نے ایک درخت پر گوشت کے بڑے بڑے لو تھڑے لٹکے ہوئے دیکھے جن کے گرد بے شمار چپلیں منڈلا رہی تھیں۔ کوؤں کا جھنڈا اُن پر ٹوٹ پڑا۔
”ادھر آجائیے۔“ ایک شکاری نے حمید کو مخاطب کیا۔

حمید چپ چاپ اُن کے پاس جا کر بیٹھ گیا جس درخت کے نیچے وہ لیٹے ہوئے تھے اُس کے تنے سے ایک موٹی سی ڈور لٹک رہی تھی جس کا سلسلہ اوپر ہی اوپر دوسرے درخت سے جاملتا تھا۔
جہاں گوشت کے لو تھڑے نظر آرہے تھے۔

”کیا آپ لوگوں کا تعلق اُس کمپنی سے ہے جو پروں سے.....!“

”جی ہاں.....!“ ایک شکاری بولا۔ ”آپ شاید یہاں اجنبی ہیں۔“

”کیوں.....؟“ حمید چونک پڑا۔

شروع میں ہمارے ساتھ ایک جم غفیر ہوا کرتا تھا لیکن اب یہ چیز لوگوں کے لئے نئی نہیں

رہی۔ پھر بھی باہر سے آنے والے اب بھی اکثر ہمارے ساتھ ہو لیتے ہیں۔“

”میں نے اخبارات میں آپ لوگوں کی اسکیم کے بارے میں پڑھا تھا۔“ حمید بولا۔

شکاری خاموش ہو کر اس درخت کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس طرح بہتری چیلیں اور دوسرے گوشت خور پرندے بھی بچھن جاتے ہوں گے۔“

حمید نے کہا۔

”جی ہاں بعد کو ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔“

”کیا آپ مجھے ایک گدھ عنایت کریں گے۔“ حمید بولا۔

”گدھ.... بھلا گدھ کیا کچھنے گا۔“ ایک شکاری سنجیدگی سے بولا۔

”آپ نہیں گے۔“ حمید نے احمقانہ انداز میں ہستے ہوئے کہا۔

”نہیں قطعی نہیں۔“ شکاری نے یقین دلایا۔

”آدمی کی بعض خواہشات بڑی احمقانہ ہوتی ہیں۔“ حمید بولا۔ ”بچپن ہی سے میری یہ

خواہش رہی ہے کہ میں ایک گدھ پالوں لیکن میری یہ خواہش آج تک نہ پوری ہو سکی۔“

دوسرا شکاری جو اونگھ رہا تھا یہ بات سن کر اٹھ بیٹھا اور حمید کو تضحیک آمیز نظروں سے دیکھتا

ہوا بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی آپ کا دولت خانہ کہاں ہے۔“

”دولت خانہ۔“ حمید نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا ”میں کوئی مہاجن نہیں ہوں خطہ کشمیر

میرا وطن ہے اور ایک چھوٹا موٹا زمیندار۔“

”خیر نہ آپ چھوٹے ہیں اور نہ موٹے۔ لیکن زمیندار ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ خیر جناب

آپ کی خواہش ضرور پوری کر دی جائے گی۔“

”حمید جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دفعتاً ایک ٹرک آکر اُن کے قریب رک گیا اگلی

نشست پر صرف ایک آدمی تھا جو صورت سے پیشہ در ڈرائیور نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک شکاری

نے اٹھ کر درخت کے تنے سے لٹکتی ہوئی ڈور کا سرا کھینچ لیا اور پھر بے شمار پرندوں کے پروں کی

پھڑ پھڑاہٹ اور اُن کی چیخوں سے فضا مکدر ہو گئی۔

درخت پر پھیلا ہوا جال پرندوں سمیت لڑھکتا نیچے آ رہا۔ بہت کم پرندے جال کی زد سے

نکل پائے تھے۔ دونوں شکاری اٹھ کر جال کی طرف لپکے۔ حمید بھی اُن کے پیچھے دوڑا۔ شاید یہ

جال بھی اُس کے لئے ایک بالکل ہی نئی قسم سے تعلق رکھتا تھا۔ ٹرک پر آیا ہوا آدمی بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

جال میں کوڑوں کے علاوہ چند چیلیس بھی تھیں اور دو ایک گدھ بھی۔ بقیہ پرندے ابھی تک شور مچاتے ہوئے اُس درخت کے گرد منڈلا رہے تھے۔ حمید بھی شکاریوں کے ساتھ جال پر جھک پڑا اور جب وہ اُسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے اس نے ان میں سے ایک کی جیب سے اس کا پرس اڑا لیا۔

اُن دونوں کو اُس کی خبر تک نہ ہوئی لیکن ٹرک میں بیٹھا ہوا آدمی اس کی حرکت دیکھ رہا تھا۔ حمید نے پہلے ہی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہ اُس آدمی کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے اور حقیقتاً سی چیز نے اُسے اس حرکت پر اکسایا تھا۔

اُس نے اُن دونوں کو جال اٹھانے میں مدد دی اور اُن کے ساتھ ٹرک تک آیا۔ جال پرندوں سمیت ٹرک پر ڈال دیا گیا۔

”شکریہ۔“ ایک شکاری حمید کی طرف مڑ کر بولا۔ ”آپ ہمیں اپنا ایڈریس دے دیں گدھ پہنچا دیا جائے گا۔“

”ہوٹل ڈی فرانس! کمرہ نمبر تیرہ... اور میرا نام سعید جو ہے۔“
 ”آف فوہ۔“ ڈرائیور بولا۔ ”تو آپ کشمیری ہیں! لیکن لب و لہجہ کشمیریوں جیسا نہیں ہے۔“
 ”میں عرصے تک اس صوبے میں رہا ہوں۔“ حمید نے کہا۔
 ”لیکن افسوس کہ اس کے باوجود بھی آپ شریف سوسائٹی کے قابل نہیں بن سکے۔“
 ”کیا مطلب....!“ حمید بگڑ کر بولا۔

”پرس نکالو....!“ ڈرائیور نے گرج کر کہا۔

حمید بے تحاشہ مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔

”ٹھہرو! ورنہ گولی مار دوں گا۔“ ڈرائیور نے لاکار۔ اس نے سچ مچ ریو اور نکال لیا تھا۔

حمید نے پلٹ کر دیکھا اور رک گیا۔ ڈرائیور ٹرک سے اتر آیا تھا۔

”ادھر آؤ....!“ اُس نے گرج کر کہا۔

حمید اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن ڈرائیور اس بات سے

قطعی لا پرواہ تھا کہ دوسرا لمحہ خود اُس کے لئے بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ حمید ان سے تین قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

”اپنا پرس نکالو اس کے جیب سے۔“ ڈرائیور نے ایک شکاری سے کہا۔

اب شکاری نے گھبرا کر اپنی جیبیں ٹٹولیں اور بے اختیار نہ انداز میں حمید پر جھپٹا۔
دفعۃً حمید چیخ مار کر زمین پر گر پڑا اور پھر ڈرائیور کو یہ تک سمجھنے کی مہلت نہ ملی کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے کس طرح نکل گیا۔

دوسرے لمحے میں حمید ان کی طرف ریوالور تانے انہیں ٹرک کے پاس سے ہٹا رہا تھا۔

”تمہاری جیبوں میں جو کچھ بھی ہو نکال کو زمین پر ڈال دو۔“

دونوں شکاری سراپسنگی کا شکار ہو گئے تھے۔ البتہ ڈرائیور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ دونوں اپنی بندوقیں بھی ٹرک میں رکھ چکے تھے۔ اس لئے اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ حمید کے حکم کی تعمیل کرتے۔ بادلِ ناخواستہ انہوں نے اپنی جیبوں سے وہ سب کچھ نکالا جو نقدی کی شکل میں تھا۔

”واہنی طرف منہ کرو۔“ حمید گرج کر بولا۔

زمین پر پڑا ہوا مال غنیمت سمیت ہوا وہ پھر لٹکارا۔ ”چل پڑو..... چلتے جاؤ..... مڑ کر دیکھا اور

موت نے چپت لگائی۔ شاباش..... لفٹ رائٹ..... لفٹ رائٹ..... لفٹ..... لفٹ!“

اور جب وہ بیس پچیس گز آگے بڑھ گئے تو وہ اچھل کر ٹرک میں آ بیٹھا۔

وہ تینوں گالیاں بکتے ہوئے ٹرک کے پیچھے دوڑ رہے تھے لیکن اب حمید کو پانا آسان کام نہیں تھا۔

شہر کے قریب پہنچ کر اس نے ٹرک چھوڑ دیا اور پیدل چل پڑا۔

وہ جلد سے جلد کیفے ڈی فرانس کی رہائش ترک کر دینا چاہتا تھا کیونکہ اس حلیہ میں اس نے

خود کو مشکوک بنالیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ اس واقعے کی رپورٹ ضرور کریں گے۔

ہوٹل ڈی فرانس پہنچ کر اُس نے حساب بے باق کیا اور ایک ویٹر کو بند گاڑی لانے کی ہدایت

دیتا ہوا پھر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس کا کل سامان ایک بستر اور ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا۔

پندرہ منٹ بعد ویٹر واپس آ گیا۔ حمید نے سامان اُس سے بھجوا دیا وہ دراصل اس فکر میں تھا

کہ گاڑی والے کی نظر اُس پر نہ پڑنے پائے۔

تھوڑی دیر بعد بند گھوڑا گاڑی شہر کے پُر رونق حصوں سے گذر رہی تھی اور حمید اندر بیٹھا اطمینان سے اپنے چہرے پر ملائم اور گھونگھریالے بال چپکانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اس صفائی سے گاڑی میں داخل ہوا تھا کہ کوچوان کی نظر اس پر نہیں پڑ سکی تھی اور سیٹ پر بیٹھتے ہی اُس نے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا تھا اور اندر ہی سے اس کوچوان کو نیا گرا ہوٹل کی طرف چلنے کو کہا تھا۔ نیا گرا ہوٹل شہر سے باہر ایک پُر فضا مقام پر واقع تھا۔ مناظر فطرت کے رسیا عموماً وہیں قیام کیا کرتے تھے۔ لیکن ہوٹل اتنا مہنگا تھا کہ عام آدمی وہاں ناشتہ کرنے کی ہمت بھی شاذ و نادر ہی کیا کرتے تھے۔ حمید نے اس ہوٹل کا نام محض اس واسطے لیا تھا کہ وہ شہر سے دور تھا۔ اس طرح دوران سفر میں اُسے اتنا وقت مل جاتا کہ وہ فریدی کے میک اپ پر ایک دوسرا میک اپ بہ آسانی کر سکتا تھا۔

اس نے آئینے پر آخری اور تنقیدی نظر ڈالی۔ سیاہ رنگ کی گھونگھریالی ڈاڑھی میں اس کا چہرہ عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے تاریک شیشوں کی عینک آنکھوں پر جماتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور پھر سیٹ کی پشت سے نکل کر پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔

یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ نیا گرا ہوٹل ہی میں ٹھہرتا۔ یہاں تک تو وہ محض لئے آیا تھا کہ اپنی شکل اطمینان سے تبدیل کر سکے۔ اگر نیا گرا ہوٹل میں اُسے کوئی کمرہ نہ بھی ملتا تو وہ پھر شہر واپس جاسکتا تھا۔ لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کمرہ بہ آسانی مل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ فریدی کو فون کر رہا تھا۔

”سعید جو بول رہا ہے.... فی الحال نیا گرہ کے چالیس نمبر میں قیام ہے۔ وجہ پھر بتاؤں گا.... جی.... نہیں بتاتا.... ضروری بات! اگر اُن چاروں میں کوئی کو توالی میں رپورٹ لکھائے تو.... الو کے پٹھے کو مطلع کر دیجئے گا۔“

فریدی وجہ پوچھتا ہی رہ گیا لیکن حمید نے ریسور رکھ دیا۔

اُس نے کمرہ بند کر کے اطمینان سے لوٹی ہوئی رقم کا جائزہ لیا۔ کل دو سو ستائیس روپے تھے۔ نیا گرہ میں دو تین دن قیام کرنے کے لئے یہ رقم کافی ہی نہیں بلکہ بہت تھی۔ چار بجے فریدی نے اُسے فون پر کال کیا۔ اُس نے بتایا کہ شکاریوں نے اپنے لٹنے کی رپورٹ پولیس کو دی ہے۔ آدمی جس نے خود کو کشمیری ظاہر کیا تھا۔ انہیں لوٹ کر چلتا بنا۔

”دیکھئے....!“ حمید بولا۔ ”آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس معاملے کو اختتام تک پہنچائے

بغیر اپنے اوپر کاہلی مسلط نہ ہونے دوں گا۔“

”اب کیا سوچ رہے ہو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کچھ نہیں حالات کا منتظر ہوں۔“

”اطلاعات دیتے رہنا۔“

”اگر ضروری سمجھا تو...!“

”کیڑے زیادہ نہ کلبلائیں تو بہتر ہے۔“ فریدی کا تلخ لہجہ سنائی دیا۔

”میں نکما نہیں ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔“ دوسری طرف سے جھلائی ہوئی آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

حمید نے فون پر ہیڈ ویئر کو اطلاع دی کہ وہ ناشتہ ڈائننگ روم ہی میں کرے گا۔

شام کا لباس پہن کر وہ نیچے آیا۔ وہ ہر قدم پر رک کر کچھ سوچنے لگتا تھا۔ پھر اچانک اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی اور ڈائننگ روم ہی میں آکر دم لیا۔ اس کی صورت تو فلسفیوں جیسی ہو ہی گئی تھی اب وہ اپنے حرکات و سکنات سے بھی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ سو فیصدی فلسفی ہے۔

لیکن یہاں پہنچتے ہی اچانک اس پر بدحواسی طاری ہو گئی۔ کیبن نمبر آٹھ میں چاروں شکاری چائے پی رہے تھے۔ وہ آہستہ سے ایک طرف ہٹ گیا لیکن نمبر سات خالی تھا۔ اس وقت جبلت کا یہی تقاضہ ہو سکتا تھا کہ وہ اسی کیبن میں جا کر بیٹھ جائے۔

بیٹھتے ہی اس نے گھنٹی بجائی۔ ویئر نے ناشتے کا سامان میز پر لگا دیا۔

حمید کے کان کیبن نمبر آٹھ کی طرف لگے ہوئے تھے۔

”ٹرک کہاں ملا تھا۔“ اُن میں سے کسی نے پوچھا۔

”بائٹم روڈ کے چوراہے پر۔“

”تم دونوں خاصے آلو ہو۔“

”بھلا ہم کیا جانتے کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ اس قسم کے لوگ ہمارے پیچھے لگے ہی رہا کرتے ہیں۔“

”خیر... بہر حال یہ اچھا کیا کہ رپورٹ کر دی۔“

”اور سنئے اُس نے اپنا پتہ حقیقتاً صحیح بتایا تھا۔ میں نے ہوٹل ڈی فرانس میں پتہ لگایا ہے لیکن وہ

ہمارے پہنچنے سے دو گھنٹے قبل ہی جاچکا تھا۔ بہر حال پولیس اب اُس گاڑی والے کی تلاش میں ہے، جو اُسے وہاں سے لے گیا تھا۔“

حمید نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے میک اپ کر چکنے کے بعد گاڑی کی کھڑکیاں کھول کر غلطی کی تھی اُسے کو چوان کے سامنے تو آتا ہی نہ چاہئے تھا۔ اگر وہ چاہتا تو نیا گرا ہو مل پہنچنے پر بھی خود کو کو چوان کی نظروں سے بچا سکتا تھا۔

جال

اس نے سوچا کہ کیوں نہ فریدی کو اُس گاڑی بان کے متعلق فون کر دے کہ وہ اُسے پولیس کے ہتھے نہ چڑھنے دے۔ گاڑی کا نمبر اُسے اچھی طرح یاد تھا اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ نمبر دیکھنے یا یاد رکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ تو اتفاقاً اُس کی نظر نمبروں پر پڑ گئی تھی اور ساتھ ہی اُسے یہ یاد آ گیا تھا کہ اُس کی بیمہ کی پالیسی کا بھی یہی نمبر ہے۔ اس طرح گاڑی کا نمبر اُسے یاد رہ گیا تھا۔

حمید نے فون کار میسور اٹھا کر پھر رکھ دیا۔

اس کے ذہن میں ایک نئی چال ابھر رہی تھی۔ تین چار منٹ تک اُس کے چہرے پر کچھ عجیب سے آثار دکھائی دیتے رہے پھر وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”فون تو کر ہی دینا چاہئے۔“ اُس نے پھر ریسور اٹھایا۔ لیکن فریدی گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس کی انگلی فون کے ڈائیل پر گھومنے لگی۔

”ہیلو.... انکیئر جلد لیش.... اوہ تو اچھا تم ہی ہو.... میں فریدی بول رہا ہوں.... کہو وہ

گاڑی ملی یا نہیں۔“

”کون سی! دوسری طرف سے آواز آئی۔“

”اماں وہی کشمیری والا کیس۔“

”جی نہیں.... ابھی نہیں ملی.... لیکن آپ....!“

”ہاں میں اس میں تھوڑی بہت دلچسپی لے رہا ہوں۔“ حمید بولا۔ ”دیکھو اگر وہ مل بھی جائے

تو اس کی رپورٹ پر فی الحال عمل درآمد نہ کرنا۔“

”بہت بہتر..... لیکن.....!“

”لیکن یہ کہ تم ہمیشہ احمق رہو گے۔ ارے بھائی جو میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔“

”بہت بہتر۔“

ریسیور رکھ کر حمید نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن وہ اب بھی یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں فریدی اور جگدیش کی ملاقات نہ ہو جائے۔

”او نہہ.....!“ اس نے سر جھٹک کر اپنا سوٹ کیس کھولا اور ایک ریوالور نکال کر جیب میں ڈال لیا۔ اب وہ زینے طے کر کے ڈائمنگ ہال کی طرف جا رہا تھا۔

اس نے ان چاروں شکاریوں کو ہال سے اٹھ کر باہر جاتے دیکھا اور تھوڑے غاصلے سے ان کا تعاقب کرنے لگا۔ اس کا خیال غلط نہیں نکلا۔ اس نے پہلے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ بیرونی پارک کی طرف جا رہے ہیں۔

پارک میں پہلے سے بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ حمید ان چاروں سے زیادہ دور نہ ہونے کی بناء پر ان کی گفتگو صاف سن رہا تھا۔

”لو یار.....!“ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا ”بعض اوقات میں واقعی حماقت کر بیٹھتا ہوں۔ باتوں کی رو میں کار سے انجن کی کنجی تک نہیں نکالی۔“

”اور دوسری حماقت مجھ سے سن لو۔“ دوسرا آدمی بولا۔ ”تم نے کار قطعی غلط جگہ کھڑی کی ہے۔ اس وقت میں نے تمہاری دل شکنی کے خیال سے تمہیں ٹوکا نہیں۔ نیا گرام میں آنے والی کاریں عموماً گیرج میں کھڑی کی جاتی ہیں، لیکن تم باہر ہی چھوڑ آئے ہو۔“

”او نہہ! چھوڑو بھی سب چلتا ہے۔“ تیسرے نے کہا۔

چاروں ایک بیچ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگے۔

گیرج عمارت کی پشت پر تھا۔ وہ کافی طویل اور تقریباً چالیس پچاس حصوں پر مشتمل تھا۔ ہر حصے پر نمبر پڑے ہوئے تھے اسے ایک چوکیدار کنٹرول کرتا تھا۔ جب بھی کوئی کار اس طرف آتی چوکیدار حصے روشن کر دیتا۔ اس کے سامنے ایک چارٹ ہوتا تھا جس پر وہ خالی اور بھرے حصوں میں نشانات لگایا کرتا تھا۔ بہر حال گیرج کو کنٹرول کرنے کا طریقہ سائنٹیفک اور بالکل نیا تھا۔ ورنہ

اتنا بڑا کیراج ایک چوکیدار کے بس کا روگ نہیں تھا۔

شکاریوں کی گفتگو سننے کے بعد حمید چپ چاپ وہاں سے کھسک گیا۔ گیرج سے تھوڑے فاصلے پر اُسے بادامی رنگ کی ایک کار کھڑی دکھائی دی۔ اُس نے اندر جھانک کر دیکھا تا لے میں کبھی لگی ہوئی تھی۔ وہ کار کو اسٹارٹ کر کے کیراج کے قریب لایا۔ چوکیدار نے ایک حصے کے نمبر روشن کر دیئے اور حمید نے کار اند لے جا کر کھڑی کر دی۔ پھر اُس نے انجن کھول کر اُس پر دست شفقت پھیرا لیکن کبھی بدستور لگی رہنے دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر پارک میں آگیا۔ چاروں شکاری اب بھی اسی بچ پر بیٹھے ہوئے تھے اور حمید بے چینی سے اُن کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اٹھ کر گیرج کی طرف چلے حمید تھوڑے فاصلے سے اُن کا تعاقب کر رہا تھا۔ اندھیرا کافی پھیل گیا تھا اور گیرج کے آخری سرے والے یکمب پوسٹ کی روشنی پورے حصے کو روشن کرنے کے لئے کافی نہیں تھا۔ شاید وہ چاروں کار کو اس جگہ نہ پا کر متحیر تھے۔ آخر کار چوکیدار نے اُن کی رہنمائی کی لیکن انہیں اُس کی زبانی یہ سن کر حیرت ہوئی کہ کسی ایسے آدمی نے کار کو گیرج میں پہنچایا تھا جو اُن میں سے نہیں تھا۔

ایک شکاری نے اندر جا کر کار کو باہر نکالنا چاہا لیکن کار اسٹارٹ ہی نہ ہوئی۔ میاں حمید نے انجن پر ذرا گہرے قسم کا ہاتھ پھیرا تھا۔

آخر ان تینوں کو بھی اُس کی مدد کے لئے اندر جانا پڑا۔

گیرج کے قرب و جوار کے حصے بالکل ویران تھے اور چوکیدار بھی اپنی جگہ پر واپس جا چکا تھا۔ حمید نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور کا دستہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دوسرے لمحے میں وہ گیرج کے اندر تھا۔

”کیا یہ کشمیری آپ لوگوں کی مدد کر سکتا ہے۔“ اس نے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔

”تم....!“ ایک چونک کر بولا۔

”ہاں میں.... ذرا اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور ہاں وہ میرا گدھ کہاں ہے!“

چاروں اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔

”تم نے میرے خلاف رپورٹ دے کر اچھا نہیں کیا۔“

”ہم پھر رپورٹ کریں گے۔“ ایک نے بگڑ کر کہا۔

”ذرا آہستہ فرزند....!“ حمید بولا۔ ”یہ ریوالور بغیر آواز کا ہے۔ شور پسند نہیں کرتا۔“
”تم ہو کون۔“

”تمہاری تجارت کے حصے کا جائز حق دار! یہاں ہر نیا کام شروع کرنے والا ہمارا حصہ ضرور نکالتا ہے۔ نہ صرف میرا.... بلکہ میرے گروہ کا بھی.... کیا سمجھے؟“

”نہ جانے کیا الٹی سیدھی ہانک رہے ہو۔ جانتے ہو شریف آدمیوں کو پریشان کرنا جرم ہے۔“
”یہ بھی جانتا ہوں اور تمہاری شرافت سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ بہر حال معاملے کی بات کرو۔“

”کیسا معاملہ....!“

”اچھی بات ہے۔“ حمید نے دھمکی دی۔ ”اگر بلی کھاتی نہیں تو ڈھلکا دیتی ہے۔ اچھا تو میں چلا.... نہ تم میرا کچھ بگاڑ سکتے ہو اور نہ پولیس۔ سردار صفدر کو میں لونڈا سمجھتا ہوں۔“

حمید ریوالور کا رخ ان کی طرف کئے ہوئے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔
”ٹھہرو....!“ ان میں سے ایک آہستہ سے بولا۔ ”تم کون ہو....!“

”ارے تم مجھے نہیں جانتے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”حالانکہ میں تم لوگوں کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں اور تمہاری ایک حرکت کی بناء پر تم سے سخت متنفر بھی ہوں۔“
”کون سی حرکت....!“

”اس اینگلو انڈین نرس کا قتل! تمہارا مقصد دوسری طرح بھی حل ہو سکتا تھا۔ مگر نہیں سردار صفدر.... جابر کے کسی شاگرد کی طرح ذہین نہیں ہو سکتا۔“

”جابر.... کون جابر....!“

”تم جابر کو بھی نہیں جانتے۔ تب تو تم نے ناحق اس کاروبار میں ہاتھ لگایا ہے۔“
”کون سا کاروبار....!“

”اوہو....!“ حمید ہنس پڑا۔ ”تو کیا آزاد بینک کا سونا یونہی خاک ہو گیا۔“

”تم کون ہو۔“ چاروں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ ان کی آوازیں خوفزدہ تھیں۔

”جابر! ایک شاگرد.... وہ جابر جو اپنے وقت کا ایک ذہین ترین آدمی تھا۔ وہ جابر جس کی

جابر کے کارناموں کیلئے جاسوسی دنیا کے ناول ”خطرناک بوڑھا“ اور ”مصنوعی ناک“ جلد نمبر 2 پڑھے۔

ناک کی جگہ ایک غار تھا اور اس کے باوجود بھی وہ ہر طرح کی آواز پر قادر تھا۔“

چاروں خاموش رہے اور حمید پھر بولا۔

”تم نے شاید اُس جاسوس کو بھی ٹھکانے لگادیا۔“

”نہیں یہ غلط ہے۔“ ایک بولا۔

”ہوگا! مجھے اس سے سروکار نہیں۔“ حمید لاپرواہی سے بولا۔ ”میں تو اپنا حصہ چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“

اور یہ لو۔۔۔۔۔ اپنے روپے۔۔۔۔۔ جابر کا کوئی شاگرد گرہ کٹ یا گھٹیا قسم کا لیرا نہیں ہوتا۔ یہ تو محض تم لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے تھا۔“

حمید نے جیب سے نوٹ نکال کر اُن کے سامنے پھینک دیئے۔

وہ چاروں کچھ نہیں بولے حمید نے پھر کہا۔

”میں یہیں اسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔۔۔۔۔ تنہا۔۔۔۔۔ کمرے کا نمبر چالیس ہے۔ اس کے باوجود

بھی میرا دعویٰ ہے کہ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ویسے ریوالور کی گولی سے مجبوری ہے وہ بھی اگر اندھیرے سے چلائی جائے۔ لیکن اس پر بھی تم نہ بچ سکو گے کیونکہ مجھ جیسے پانچ آدمی تمہارے

راز سے واقف ہیں اور میں انہیں کاغذ سنبھال رہا ہوں۔“

”ریوالور جیب میں رکھ لیجئے۔“ ایک شکاری آہستہ سے بولا۔ ”اس پر غور کیا جائے گا۔“

حمید نے ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

پھر وہ چاروں حمید سمیت گیرج سے باہر آگئے۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ حمید نے کہا اور وہ سب پھر ڈائننگ ہال میں آگئے۔

”نہیں یہاں ٹھیک نہیں ہے۔“ اُس نے پھر کہا اور انہیں اپنے کمرے میں لے آیا۔

اُن میں سے ایک آدمی کو حمید بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اُسے الجھن میں

ڈالے ہوئے تھیں۔ اس کا ذہن بار بار دہرا رہا تھا ”کہاں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے۔“

پھر دفعتاً اُسے اُس ڈاکٹر کی آنکھیں یاد آگئیں جس نے اُسے شراب پلائی تھی۔ حمید نے

انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”معاملات طے ہو جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔“ حمید تھوڑی دیر بعد بولا۔

”ہم بڑی دیر سے آپ کے اس مذاق سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔“ اُس شکاری نے کہا جسے

حمید پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خیر....!“ حمید بڑا سامنے بنا کر بولا۔ ”مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔“

”آپ اعتراف کرتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جس نے ان دونوں کو لوٹا تھا؟“ شکاری نے پوچھا۔

”ہاں! اور وہ فون رکھا ہوا ہے! تم پولیس کو اطلاع دے دو کہ تم نے اُس آدمی کو پالیا ہے۔“

حمید نے لا پرواہی سے کہا۔

وہ چاروں عجیب قسم کی کش مکش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جانی پہچانی آنکھوں والا آہستہ سے بولا۔

”ہم سے کس قسم کا سمجھوتہ کرنا ہے؟“

”آدھا.... آدھا....!“

”یعنی....!“

”تیس سیر سونا اور وہ جو دلاور نگر سے آرہا ہے۔“

”بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔“

حمید نے قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا۔ پھر بولا۔

”بلیک میل شریف آدمیوں کو کیا جاتا ہے۔ اگر تم ہمارا حصہ نہیں دو گے تو ہم زبردستی چھین

لیں گے۔“

”یہ بات ہے۔“ شکاری کی بھنویں تن گئیں۔

”سنو تم چار ہو اور میں اکیلا۔ مجھے گھور کر نہ دیکھو۔“ حمید ہنس پڑا۔

شکاری پھر کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

حمید نے خود ہی چھیڑا۔ ”ہم تمہاری ایک ایک بات سے باخبر ہیں۔ کیا تم نے شہر کے مشہور

جاسوس کو دوسری طرف الجھا دینے کے لئے سارہ کو قتل نہیں کیا۔“

”ذرا آہستہ بولو۔“ شکاری نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”سردار صفدر مجھے یقین ہے کہ تم تا سبھی سے کام نہ لو گے۔“

”کیا....!“ شکاری اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھو بیٹھو....!“ حمید نے پُر سکون لہجے میں کہا۔ ”میرے علاوہ میرے پانچ ساتھی بھی

تمہیں اچھی طرح پہچانتے ہیں۔“

دوسرے شکاری بھی کھڑے ہو گئے۔ انہیں اپنے ریوالور نکال لینے کا موقع مل گیا تھا۔ لیکن حمید کے تیز قہقہے سن کر ان کے ہاتھ کانپ گئے۔

”فضول ہے دوستو! پانچ خوفناک آدمی بھوتوں کی طرح تمہارے پیچھے لگ جائیں گے اور وہ مجھ سے بھی زیادہ شاطر ہیں۔“

سردار صفدر نے اپنے ساتھیوں کو ڈانٹا اور انہوں نے پھر اپنے ریوالور جیبوں میں ڈال لئے۔

”چلو منظور....!“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن میری بھی دو شرائط ہیں۔“

”کیا....؟“

”تمہیں اپنے ساتھیوں کو بھی مجھ سے ملانا پڑے گا۔“

”دوسری شرط....؟“ حمید نے پوچھا۔

”بیٹھے بیٹھے حصہ نہیں ملے گا۔ تمہیں ہمارا ہاتھ بٹانا پڑے گا۔“

”دوسری شرط قطعی منظور ہے۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”لیکن پہلی شرط کے سلسلے میں مجھے

دہرانا پڑے گا کہ میں جابر کا شاگرد ہوں۔“

”صاف صاف کہو۔“

”بالکل صاف ہے وہ پانچ آدمی بھی ہاتھ بٹائیں گے لیکن وہ تم پر ظاہر نہیں کئے جاسکتے۔“

”سمجھوتے کے لئے اعتبار شرط۔“ سردار صفدر نے سنجیدگی سے کہا۔

”استاد جابر معاملے کا پکا تھا لیکن وہ کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔“

”تب تو پھر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔“

”تمہاری خوشی۔“ حمید لاپرواہی سے بولا۔ ”ویسے سترہ ڈاؤن پر تمہیں سونا تو کیا لوہا بھی نہیں

ملے گا۔“

”کیا مطلب....!“ صفدر چونک کر بولا۔

”تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ اس لوٹے نے تمہیں یہ اطلاع نشے کی حالت میں دی تھی۔“

”تم یہ بھی جانتے ہو۔“ سردار صفدر کا منہ حیرت سے پھیل گیا۔

”میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہمیں ایک ایک حرکت کا علم ہے اور میں یہ بھی جانتا

ہوں کہ وہ سونا حقیقتاً کب آئے گا۔“

”کب آئے گا....؟“

”سردار صفدر میں نشے میں نہیں ہوں۔“ حمید نے قہقہہ لگایا۔

صفدر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ آخر کار وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ”اچھا دوست! مجھے منظور ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتادوں کہ میں دغا بازوں کو زندہ نہیں رہنے دیتا۔“

”استاد جابر کا بھی یہی اصول تھا۔“ حمید نے خندہ پیشانی سے کہا۔

”کل دس بجے کارخانے میں آجاؤ۔“ صفدر اٹھتا ہوا بولا۔ ”لیکن اگر اس دوران میں پولیس

کے ہتھے چڑھ جاؤ تو ہمیں الزام نہ دینا کیونکہ اس گاڑی کی تلاش جاری ہے۔“

”اُس کی فکر مت کرو۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔ ”میرے ساتھیوں نے کوچوان کو سنبھال لیا

ہے۔ جابر کے شاگرد کچا کام کبھی نہیں کرتے۔“

”اچھا تو شب بخیر۔“

اعلیٰ ترین اخلاق کے مظاہرے کے طور پر حمید انہیں گیرج تک نہ صرف چھوڑنے آیا بلکہ

گاڑی کا انجن ٹھیک کرنے میں انہیں مدد بھی دی۔

ایک انکشاف

اُن کی کار چلی بھی گئی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حمید اپنی جگہ پر جم سا گیا ہو۔ وہ دراصل

فریدی تک پہنچنے کے لئے بُری طرح بے چین تھا۔ غیر متوقع طور پر حالات نے نئی کروٹ لی

تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دوسرا قدم کیا ہونا چاہئے اور پھر وہ اس پر اپنی کار

گڈاریوں کا رعب بھی ڈالنا چاہتا تھا۔

یہاں ٹیکسی کی توقع فضول تھی کیونکہ یہاں زیادہ تر ایسے ہی ذی حیثیت لوگ آتے تھے جن

کی اپنی کاریں ہوں۔ اُس نے سوچا چلو پیدل ہی سہی کبھی نہ کبھی تو پہنچ ہی جائے گا۔ لیکن اُسے

خوش نصیبی ہی کہنا چاہئے کہ پھانک سے باہر قدم نکالتے ہی اُسے ایک ٹیکسی دکھائی دی۔ جو سڑک

کے کنارے کھڑی تھی اور اس کا ڈرائیور نارچ کی روشنی میں انجن پر جھکا ہوا تھا۔ شاید کوئی خرابی

آگئی تھی۔

”شہر چلو گے بھی۔“ حمید نے لہک کر پوچھا۔

”کیوں نہیں.... مگر شاید کچھ دیر لگ جائے۔“ ڈرائیور بدستور سر جھکائے ہوئے بولا۔

”پرواہ نہیں.... میں انتظار کروں گا۔“ حمید دروازہ کھول کر اندر بیٹھتا ہوا بولا۔

دو تین منٹ بعد انجن اشارت ہو گیا۔

”کہاں جائیے گا۔“ ڈرائیور نے کھڑکی سے حمید پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”تیرہ سومر سٹ اسٹریٹ۔“ حمید نے جواب دیا اور ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔

”انسپکٹر فریدی کے یہاں جائیے گا۔“ ڈرائیور بولا۔

حمید اچھل پڑا اور اس کا ہاتھ بے اختیار جیب کی طرف گیا۔ ڈرائیور بدستور اسٹیرنگ کرتا رہا۔

”کیا تم جانتے ہو۔“

”ہاں....!“ ڈرائیور بولا۔ ”فریدی کو بھی اور فریدی کے پٹھے حمید کو بھی۔“

حمید نے ریوالور کی نال اس کی پشت سے لگادی۔

”روکو! ورنہ گولی مار دوں گا۔“

”ماردو....!“ ڈرائیور نے لاپرواہی سے کہا اور اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ ٹیکسی بدستور چلتی رہی۔

”روکو....!“

”واہ یہ اچھی زبردستی ہے۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”اچھا چلو کرایہ بھی مت دینا۔“

”میں سچ مچ مار دوں گا۔“ حمید گرج کر بولا۔

”سچ مچ مار دو....!“ ڈرائیور ہنس کر بولا۔ ”لیکن تمہارے ریوالور کی گولیاں تو میرے پاس ہیں۔“

حمید نے غور کیا تو حقیقتاً ریوالور کو بالکل خالی پایا۔

”کیوں ہے نا یہی بات!“ ڈرائیور نے کہا۔ ”بہت چالاک بنتے تھے۔ آج ایک اناڑی کی جیب

سے پرس غائب کر کے تم اپنی ہاتھ کی صفائی پر پھول گئے تھے۔ اب بتاؤ کیسی رہی.... سردار صفدر

کو دھوکا دینا آسان کام نہیں۔“

حمید کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ لیکن اُس نے جی کڑا کر کے قہقہہ لگا ہی دیا اور پھر پر جوش انداز

میں بولا۔

”میرے پانچوں ساتھی....!“

”سر سے بندل ہیں۔“ اس کی بات کاٹ دی گئی۔

”جابر کے شاگرد....!“ حمید ہکلا یا۔

”نرے چغد ہیں۔“ ڈرائیور بچ ہی میں بول پڑا۔

”لیکن میں نہیں ہوں۔“ حمید جھلا کر بولا۔

”تم چغد سے بھی کمتر ہو۔“

دفعتاً حمید نے ریوالور پھینک کر اُس کی گردن پکڑ لی۔

”خیر تم میں اتنی طاقت نہیں معلوم ہوتی لیکن میں گاڑی درخت سے ٹکرائے دیتا ہوں۔“

اور حمید نے اچانک محسوس کیا کہ ڈرائیور کی دھمکی عملی جامہ پہننے ہی والی ہے۔ اس نے گردن چھوڑ دی اور بدحواس ہو کر سیٹ پر گر گیا۔

ڈرائیور بڑی طرح ہنس رہا تھا۔

کار شہر کی سڑکوں سے گذرتی ہوئی سومر سٹ اسٹریٹ کی طرف ہوئی اور حمید پاگل ہو جانے کی حد تک الجھنے لگا اسے توقع تھی کہ وہ کہیں اور لے جایا جائے گا۔ لیکن وہ سومر سٹ اسٹریٹ....!

ٹیکسی فریدی کی کوٹھی کی کپاؤنڈ میں داخل ہو رہی تھی اور حمید کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ رہی تھیں۔ ٹیکسی پور ٹیکو میں رک گئی۔

”اُترئے سرکار....!“ ڈرائیور مڑ کر بولا اور حمید کے منہ سے چیخ نکل گئی ڈرائیور کی گھنی ڈاڑھی غائب تھی اور فریدی کی طنز آمیز مسکراہٹ اُس کے سینے میں کچوکے لگا رہی تھی۔

”معاف کیجئے گا.... میں پہچان گیا تھا۔“ حمید کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”ضرور ضرور.... اسی لئے میرا گلا بھی گھونٹا جا رہا تھا.... چلو اترو۔“

وہ دونوں ٹیکسی سے اتر کر اندر آئے۔

”لیکن اس کی کیا ضرورت تھی۔“ حمید جھلا کر بولا۔

”میں نے سوچا کہ کہیں تم اپنی کار گزاری پر مغرور نہ ہو جاؤ اسلئے ایک ہلکا سا ڈوز ضروری ہے۔“

”آپ واقف ہیں۔“

”تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں وہاں جھک مار رہا تھا۔“ فریدی نے ہونٹ سکڑ کر کہا۔
 ”اگر ضرورت پڑ جاتی تو میں تمہارے اُن پانچوں ساتھیوں میں سے ایک کارول تو ادا کر ہی دیتا۔“
 ”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں نے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔“ حمید نے خشک لہجے میں کہا۔

”میں یہ تو نہیں کہتا۔ آج میرا دل چاہتا ہے کہ میں تم پر فخر کروں۔“
 اس جملے پر حمید کے تلوؤں سے کھوپڑی تک تری دوڑ گئی۔
 ”لیکن آپ نے میرے ریوالور سے کارولس کس طرح غائب کئے تھے۔“
 ”جب تم ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے اُس وقت میں نے ریوالور تمہاری جیب سے نکال لیا تھا اور انجن ٹھیک ہو جانے کے بعد جب میں نے تم سے گفتگو کی تھی اُسی وقت وہ تمہاری جیب میں واپس بھی چلا گیا تھا۔“
 ”کمال ہے۔“

”لیکن تم نے انہیں لوٹا کس طرح تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔
 حمید نے پورا واقعہ دہرانے کے بعد کہا۔ ”میں نے آپ کا نام لے کر جلد لیش سے کہہ دیا تھا کہ وہ گاڑی بان کی اطلاع پر تفتیش نہ کرے۔“
 ”یہ تم سچ مچ عقل مند ہوتے جا رہے ہو۔“ فریدی اُسے گھور کر بولا۔ ”کیوں نہ ہو خود بھی تو پھنسے ہو۔“

”جناب میں شروع ہی سے عقل مند ثابت ہو رہا ہوں۔“ حمید نے اکڑ کر کہا۔ ”اب آپ کیا فرماتے ہیں سردار صفدر کے متعلق۔“

”ٹھیک ہے وہ سردار صفدر ہی ہے۔“ فریدی بولا۔ ”اُس کی موت ہی کچھ مشکوک قسم کی ہوئی تھی۔ جلی ہوئی عمارت سے جو لاش نکلی تھی وہ کسی اور کی رہی ہوگی۔“

”لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ کو ان شکاریوں پر شبہ کس طرح ہوا۔“

”کوؤں کی وجہ سے۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”ہاں! میں نے ایک بار کوئے ہی کی وجہ سے سونے کو خاک ہوتے دیکھا تھا۔“

حمید رک کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فریدی کچھ اور بھی کہے گا۔ لیکن اُسے

مایوسی ہوئی اور مایوسی کا لازمی نتیجہ جھلاہٹ تو ہوتی ہی ہے۔

”میں نے بھی ایک بار۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھیجنے کر بولا۔ ”کوے ہی کی وجہ سے آدمی کو کوا ہوتے دیکھا ہے۔“

فریدی ہنسنے لگا۔

”بچپن میں مجھے کیمیاگری کا خط تھا۔“ اُس نے کہا اور اسی سلسلے میں میں نے سونے کو خاک ہوتے بھی دیکھا تھا۔

”لیکن کوے۔“ حمید بے صبری سے بولا۔

”وہی بتانے جا رہا ہوں۔“ فریدی سگار سلگاتا ہوا بولا۔ ”میرے والد صاحب کے ایک دوست کیمیاگر تھے۔ وہ اکثر ہمارے ہی یہاں آکر تجربے کیا کرتے تھے۔ اُن کے پاس کئی ایسے نسخے تھے جو صد ہا سال سے سینہ بسینہ منتقل ہوتے ہوئے ان تک پہنچے تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی مجھے اس کا چمکا لگ گیا۔ اُن دنوں ایک شعر جو دراصل کیمیا کا نسخہ تھا میرے والد اور اُن کے دوست کے درمیان موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ چلو تمہیں وہ شعر بھی سنا دوں۔

گفت از شیخ مغرب، ز رنخ و سرب و زہیق گوگرد و طویار

در خون تیرہ ترکن اور ابتار در کن، عجلت مکن خدا را

ہاں تو جناب اس نسخے میں ”خون تیرہ“ کا معنی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابجد کے قاعدے سے بھی زور مارا گیا لیکن لا حاصل! آخر سوچا گیا کہ کوے کے خون سے شروعات کی جائے۔ پھر ہر کالی جاندار شے کے خون کا تجربہ کیا گیا جو کامیاب نہ ہو سکا۔ کوے کے خون والا تجربہ ایک حد تک کامیاب رہا تھا اس سے جو دھات تیار ہوئی تھی وہ سونے کی سی رنگت رکھتی تھی لیکن جب اُسے نو سادر چھڑک کر پگھلایا گیا تو وہ دھات خاک کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔

”ارے....!“ حمید کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

فریدی پھر خاموش ہو گیا تھا۔ حمید تھوڑی دیر بعد بولا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خون تیرہ کا معنی حل ہو جائے تو سونا بن جائے گا۔“

”قطعاً....!“

”اور یہ زہیق وغیرہ کیا ہے۔“

”زہتی پارہ کو کہتے ہیں۔ زرنخ ہڑتال کو۔ سرب معنی سیسہ۔ گوگرد گندھک کو اور طوطیا تم جانتے ہی ہو گے۔ کیونکہ اس کا دوسرا ہم قافیہ لفظ تم پر صادق آتا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیا کیا جانتے ہیں۔“

”میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“ فریدی نے معصومیت سے کہا۔

”تو آپ کو کیمیا کے اور بھی نئے معلوم ہوں گے۔“

”سینکڑوں۔“

”کوئی کامیاب بھی ہوا۔“

”ایک بھی نہیں! ارے میاں یہ خطبہ ہے۔ دھاتوں کی شکل تبدیل کی جاسکتی ہے لیکن اصلیت نہیں۔ عربوں نے اسے بطور فن اختیار کیا تھا اور اسے الکیما کے نام سے پکارتے تھے۔ مغربیوں نے اسے اپنا کرا لکی بنالیا۔ پھر اسی کو کیمسٹری کا نام دے کر اس کا دائرہ بہت وسیع کر دیا گیا۔“

”لیکن میں نے سنا ہے۔“ حمید بولا ”کہ بہتیرے سادھو جڑی بوٹیوں کے ذریعہ کھری چاندی اور کھرا سونا بنا لیتے ہیں۔“

فریدی ہنسنے لگا.... پھر بولا۔

چلو ایک سادھو صاحب کی غزل اسی موضوع پر سن لو۔

تین پات کا بروا جیہہ کا جانے سب کوئے

ہائے پھولے ہائے پھولے، پھولے بارہ ماس

رنگ نکال کے بنگ میں ڈالو تر تے چاندی ہوئے

اب اگر ہمت ہو تو ڈھونڈ نکالو اس تین پتیوں والے پودے کو جس میں سال بھر پھول آتے رہتے ہیں جسے ہر شخص جانتا ہے اُس کے پھول کا رنگ نکال کر رائے میں ڈالو چاندی ہو جائے گا۔ ایک دوسرے بزرگوار فرماتے ہیں۔

دھات سے دھات لڑا مرے پوتا

کہاں کی بوٹی کہاں کا بونا

”یعنی جڑی بوٹیوں کا چکر فضول ہے۔ دھات کو دھات سے لڑاؤ چاندی یا سونا بن جائے گا۔

میرے پاس دھات سے دھات لڑانے کا نقشہ بھی موجود ہے۔ لیکن، حمید صاحب سب کو اس

ہے۔ پھر وہی کہوں گا کہ اصلیت نہیں بدلتی صرف رنگ تبدیل ہوتا ہے۔“
 ”میں کوشش کروں گا۔“ حمید نے کہا۔

”اور اُسی دن میرے ہی ہاتھوں جیل میں نظر آؤ گے۔“
 ”کوئی آسان سانس نہ بتائیے۔“

”ختم کرو یہ قصہ اور کام کی بات کرو۔“ فریدی اکتا کر بولا۔
 ”میں خون تیرہ کا معممہ ضرور حل کروں گا۔“

”اور نتیجے کے طور پر خوک تیرہ ہو جاؤ گے۔“
 ”یعنی.... مجھے فارسی کم آتی ہے۔“

”کالا سور....!“

”اوہ تو کالے سور کا خون!“ حمید جلدی سے بولا۔

”بکومت! وقت کم ہے۔“ فریدی نے جھنجھلا کر کہا۔

حمید تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”شہزادے والی بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔“

”وہ بات....!“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”جہاں تک میں سمجھا ہوں وہ بیچاری بھی دھوکے ہی میں ماری گئی۔ خیر اس مسئلے کو فی الحال ملتوی رکھو! تو تم کل دس بجے اُن لوگوں سے مل رہے ہو۔“

”خیال تو یہی ہے۔“

”لیکن اب تم مجھ سے نہیں ملو گے۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا....؟“

”انہیں تمہاری طرف سے پورا پورا اطمینان ہونا چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں خود جب ضروری سمجھوں گا تمہیں کہیں نہ کہیں مل جاؤں گا۔“

”آخر آپ کی اسکیم کیا ہے۔“

”میں انہیں اس وقت پکڑنا چاہتا ہوں جب وہ ٹرین میں ڈاکہ مار رہے ہوں۔“

”اوہ....!“

”دوسری بات یہ کہ تمہیں کوؤں کا صحیح مصرف معلوم کرنا ہے۔“

”مگر.... وہ تو ابھی آپ بتا ہی چکے ہیں۔“ حمید بولا۔

”ضروری نہیں کہ میرا خیال درست ہی ہو۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر یہ لوگ خود کو شہرت کیوں دے رہے ہیں۔ یہ کام

نہایت خاموشی سے بھی ہو سکتا تھا۔“

”انہوں نے بڑا نفسیاتی طریقہ اختیار کیا۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”چھپ کر کام کرنے

والے عموماً قانون سے ڈرتے ہی رہتے ہیں اور یہی خوف بعض اوقات ان سے ایسی غلطیاں کرا دیتا

ہے کہ ان کی گردن قانون کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف کسی قسم کا ہنگامہ برپا کر کے

کام کرنے والوں کو بڑی تقویت دیتی ہے اور یہ تقویت ان میں خود اعتمادی پیدا کر کے انہیں

غلطیوں سے بچاتی ہے۔“

”کیا انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔“

”میں یہ تو نہیں کہتا کہ اُن سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ انہوں نے یہی ایک زبردست غلطی

کی کہ تمہیں شراب پلا کر تم سے کوئی بات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ بھی اندازہ نہ لگا سکے

کہ حقیقتاً تمہیں نشہ ہو گیا ہے یا صرف ترنگ میں ہو۔“

”پھر....!“

”میرے کہنے کا مطلب دراصل یہ تھا....!“

دفعۃً ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فریدی نے ریسیور اٹھا لیا! گفتگو کرتے وقت اس کے ماتھے پر

سلوٹیں ابھر آئیں اور پھر وہ ریسیور رکھ کر حمید کی طرف مڑا۔

”سنا! تم نے جگہ لیش تھا! اُس گاڑی کا پتہ لگ گیا جس میں تم نیا گرا ہو مل تک گئے تھے۔ ہو مل

ڈی فرانس کے ویڑنے اُسے شناخت کر لیا ہے.... اور کوچوان گاڑی میں مردہ پایا گیا ہے۔ اُس کی

داہنی کینٹی پر گولی لگی ہے۔“

”ارے....!“

”ہاں.... اور اب تمہارا نیا گرہ ہو مل واپس جانا درست نہیں۔ ان لوگوں نے تمہیں ایک

دوسرے قتل میں بھی پھانسنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اب بھی تمہاری اصلیت سے واقف نہیں۔“

شکاری کی چال

بارہ بجے رات کو حمید آر لکچو میں ایک کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آر لکچو بھی شہر کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں سے تھا۔

فریدی نے اس کا پرانا میک اپ بگاڑ کر اُسے دوسری شکل میں تبدیل کر دیا تھا اور یہ شکل کچھ اتنی غیر دلچسپ اور معمولی تھی کہ وہ بھی آدمیوں کی اس بے پناہ بھیڑ میں آگیا تھا، جو دیکھنے والوں پر کوئی اثر قائم کئے بغیر گذر جاتی ہے۔

دوسرے دن صبح وہ ایک ٹیکسی کر کے اُس کارخانے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں کوؤں کے پروں سے ایک حیرت انگیز چیز بنائی جانے والی تھی جو بیک وقت کاغذ بھی تھی اور کپڑا بھی۔ اس کارخانے کی عمارت جس کے بعض حصے ابھی زیر تعمیر ہی تھے۔ دولت گنج کے اُس ویران علاقے میں واقع تھی جہاں گرمیوں کے موسم میں شہر کے بعض ٹھیکیدار اینٹوں کے پڑاؤے لگایا کرتے تھے۔ کارخانے میں داخلہ نیجر کی اجازت سے ہوتا تھا اس لئے ابھی تک صرف شہر کے معزز اشخاص ہی اندر تک پہنچ سکے تھے لیکن اسکولوں اور کالجوں کے طلباء کو اجازت مل جاتی تھی مگر اس کے لئے بھی انہیں اپنے پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر کے سفارش نامے لانے پڑتے تھے۔

حمید پھانک پر روکا گیا۔ جنرل نیجر کا آفس چہار دیواری کے اندر تھا اُس نے چوکیدار کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں جنرل نیجر سے ملنا چاہتا ہے لیکن اُس نے اندر نہ جانے دیا۔

”اچھا تو پھر میرا نام ہی جنرل نیجر تک پہنچا دو۔“ اُس نے کہا۔

چوکیدار اس پر تیار ہو گیا۔ حمید نے جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر اُس پر ”جابر“ لکھا اور چوکیدار کو دے کر اطمینان سے پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ چوکیدار نے وہ پرچہ ایک دوسرے آدمی کو دے دیا۔

تھوڑی دیر بعد حمید طلب کر لیا گیا۔ جنرل فیجر کے کمرے میں وہ چاروں شکاری موجود تھے۔ ان کے علاوہ ایک آدمی اور بھی تھا، شاید اس سازش میں جنرل فیجر کا رول ادا کر رہا تھا۔ چاروں شکاری حمید کو حیرت سے دیکھنے لگے کیونکہ یہ وہ تو نہیں تھا جس سے انہوں نے پچھلی رات نیا گرہ میں گفتگو کی تھی۔

”میں وہی ہوں۔“ حمید ان کی طرف قدرے جھک کر بولا۔ ”اور تمہیں یہ بتانے کے لئے آیا ہوں کہ کوچوان والے واقعے سے ہم لوگ قطعی مرعوب نہیں ہوئے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ سردار صفدر نے اپنے چہرے پر الجھن کے آثار پیدا کر کے کہا۔
 ”تم نے اُسے اسی لئے تو مار ڈالا ہے کہ پولیس میرے خلاف اپنی جدوجہد کچھ اور تیز کر دے۔“
 ”یہ غلط ہے! ہم نے اُسے دیکھا بھی نہیں۔“

”خیر چھوڑو....!“ حمید لاپرواہی سے بولا۔ ”میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“
 ”سترہ ڈاؤن والی بات حقیقتاً غلط تھی۔“ سردار صفدر نے کہا۔

”بہت دیر میں سمجھے۔“ حمید حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولا۔
 ”شاید.... سراغ رسانوں کو اس کا علم ہو گیا ہے۔“
 ”میں ایسا نہیں سمجھتا....!“ حمید نے کہا۔

”کیوں....؟“

”جہاں تک میرے علم میں ہے! ابھی تک کوئی اس کے متعلق سوچ ہی نہیں سکا۔“
 ”لیکن....!“ سردار صفدر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”اخبارات بار بار پچھلے ڈاکے کا حوالہ دے رہے ہیں۔“

”دے رہے ہوں گے۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ سونا بدل دیا گیا تھا۔“

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید خود ہی بولا۔
 ”تم نے اُس لڑکی کو مار کر غلطی کی۔ تجھے ڈر ہے کہ کہیں اُسی قتل کے سلسلے میں یہاں کا بہترین دماغ تمہارے راستے پر نہ لگ جائے۔“
 ”کون....؟“

”وہی فریدی! جس کی کھال اُدھڑنے کے لئے میں عرصے سے بے تاب ہوں۔ تمہیں شاید اس کا علم نہ ہو کہ سرجنٹ حمید کو اُسی نے غائب کر دیا ہے اور اب اس قتل کے معاملے میں الجھا ہوا ہے۔ تم نے ایک دوسری غلطی اور بھی کی ہے۔ اُسے شاہد ہی بنا رہے دینا تھا۔ اس کی طرف سے تم نے سارہ کو جو خط لکھے تھے اُن میں حمید کے دستخط نہ کرنے چاہئیں تھے۔ تمہیں شاید یہ نہ معلوم ہو کہ فریدی کے ہاتھ سارہ کی ڈائری لگ گئی ہے اور اس سے اُس نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ سارہ اُسے بحیثیت حمید جانتی ہی نہیں تھی۔“

”یہ تم بڑے کام کے آدمی ہو۔“ سردار صفدر حیرت سے بولا۔
 ”یہی نہیں میرے دوست! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دلاور نگر والا سونا کب اور کس ٹرین سے آئے گا۔“

”تم سبھی کچھ جانتے ہو۔ مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں۔“ سردار صفدر ہنس کر بولا۔
 ”لیکن اگر تم کوؤں کے پروں کا استعمال ثابت نہ کر سکے تو....!“ حمید نے سنجیدگی سے پوچھا۔
 سردار صفدر پھر ہنس پڑا۔

”شاید اب تم اس پر بھی کچھ روشنی ڈالو گے۔“ اُس نے کہا۔
 ”نہیں.... کیونکہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا البتہ اس پر یقین ضرور ہے کہ کوؤں کے پروں سے کبھی کچھ نہ بنا سکو گے۔“
 ”تم ابھی ہماری تکنیک سے واقف نہیں ہو اسی لئے ایسا کہہ رہے ہو۔“ صفدر سنجیدگی سے بولا۔ ”آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔“

حمید اٹھ کر اُن کے ساتھ ہولیا۔ وہ اس عمارت میں آئے جہاں مشینوں کا شور گونج رہا تھا۔
 ”یہ دیکھو....!“ سردار صفدر نے دھکے ہوئے پروں کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔
 ”ٹھیک ہے! بہت صفائی سے دھکے گئے ہیں۔“ حمید نے سیاہ رنگ کا تھوڑا سا سفوف لیکر چٹکی میں مسلتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اسے ایسے ریشوں میں کس طرح تبدیل کرو گے جن سے تار بنایا جاسکے۔“
 ”ایسا ممکن ہے۔“ سردار صفدر بولا۔ ”ہم نے ایک ایسی چیز دریافت کر لی ہے جس کے ذریعہ سے ریشوں میں تبدیل کیا جاسکے گا۔“

سردار صفدر اُسے باتوں میں لگائے ایک دوسرے کمرے میں لایا۔ دروازے میں قدم رکھتے ہی

حمید کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ایک سب انسپکٹر اور دو پولیس کا نشیمل شائدان کا انتظار کر رہے تھے۔ حمید اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سردار صفدر کو گھورنے لگا اور صفدر زہریلی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”ہاں تو اب تم ان شریف آدمیوں سے معاملہ طے کر لو۔“
 ”بہتر ہے۔“ حمید نے لا پرواہی کی نہایت شاندار ایکٹنگ کی۔ ”لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں! معلوم نہیں اب تم کون سی چال چلنے والے ہو میں پھر کہتا ہوں کہ ہم میں کوئی باعزت سمجھوتہ ہو جانا چاہئے.... نہیں نہیں مجھے اپنا سرمایہ چاہئے۔“

”سن لیا آپ نے۔“ سردار صفدر نے سب انسپکٹر کی طرف مڑ کر کہا۔
 ”آپ حراست میں لئے جاتے ہیں۔“ سب انسپکٹر نے حمید سے کہا۔
 ”کیوں....؟ کس لئے؟“

”آپ ان لوگوں پر چند بے بنیاد الزامات لگا کر انہیں بلیک میل کرنا چاہتے ہیں۔“

حمید سردار صفدر کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور آہستہ سے بولا۔

”اور تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ کل میں نے ہی تمہارے تین آدمیوں کے روپے چھینے تھے اور میں نے ہی اُس کو چوان کو قتل کیا ہے۔“

”کیا....؟“ سب انسپکٹر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ سردار صفدر کے چہرے پر بھی سراپسی مگنی طاری ہو گئی تھی۔ اُس نے شائد سب انسپکٹر کو اس کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

”جی ہاں۔“ دفعتاً حمید روہانسی آواز میں بولا۔ ”ان کم بختوں نے مجھے برباد کر دیا۔ اپنے اس بے نیکی کام میں میرا روپیہ لگوا کر میرا دیوالہ نکال دیا اور اب میں جو اس پر احتجاج کرتا ہوں تو مجھے طرح طرح کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ ابھی کل ہی انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں پھنسا دوں گا۔ کل ان کے آدمیوں کو کسی نے لوٹ لیا اور انہوں نے میرے گرد جال بن دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی جگہ تمہیں بھجوائیں گے۔“

”کیوں....؟“ سب انسپکٹر صفدر کی طرف مڑا۔

”جھوٹا سراسر جھوٹ۔ ہم نے یہ کبھی نہیں کہا۔“

”بہر حال آپ کے اس جملے کی بے ساختگی یہی بتاتی ہے کہ یہ حقیقتاً آپ کے حصے دار ہیں۔“

سب انسپکٹر مسکرا کر بولا۔

”نن.... نہیں.... غلط ہے۔“ سردار صفدر ہکا کر رہ گیا۔

”کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے۔“ حمید نے سب انسپکٹر سے کہا۔
”جی نہیں۔“

”تار جام والے سیٹھ دھنی رام کا نام تو سنایا ہو گا۔“

”جی ہاں.... جی ہاں۔“

”میں وہی ہوں۔“

”اوہ....!“

”غلط.... بالکل بکواس۔“ سردار غضبناک آواز میں چیخا۔ ”اس نے ہمیں بدل رکھا ہے۔“

”چلے یک نہ شد دو شد۔“ حمید ہنس کر بولا۔ ”شاید تمہارا دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔ دیکھو

میاں تمہیں میرا سرمایہ واپس کرنا پڑے گا۔“

”میک اپ ہے۔“ سردار صفدر مکاتمان کر ہوا میں لہراتا ہوا بولا۔

”چلے صاحب! اس کا بھی اطمینان کر لیجئے۔“ حمید نے سب انسپکٹر سے کہا۔ ”منہ دھلوائیے میرا۔“

”نہیں صاحب۔“ سب انسپکٹر جھٹا کر بولا۔ ”آپ ان لوگوں کے خلاف باقاعدہ رپورٹ

کیجئے۔ خواہ مخواہ میرا تناؤ وقت برباد ہوا۔“

”ٹھہریئے۔“ حمید نے جلدی سے کہا۔ ”میں بھی چلتا ہوں آپ کے ساتھ ورنہ یہ لوگ

مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔“

”یہ بات ہے! اچھا رپورٹ میں یہ بھی لکھوائیے گا۔ چلے میرے ساتھ۔“

”ٹھہریئے۔“ صفدر گھبرا کر بولا۔ ”سیٹھ دھنی رام جی.... مجھے آپ کے مطالبات منظور ہیں۔“

”دیکھا آپ نے۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”اگر آپ نے سمجھو تو کر بھی لیا تو پولیس ان لوگوں پر دھوکہ دہی کے سلسلے میں مقدمہ

ضرور چلائے گی۔“

”انسپکٹر صاحب.... ذرا ٹھہریئے۔“ سردار صفدر لجاجت سے بولا۔

پھر ہرے رنگ کے کاغذات کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی، جو صفدر کے جیب سے طلوع

ہو کر سب انسپکٹر کی جیب میں غروب ہو گئی۔

”خیر....!“ سب انسپکٹر ہنس کر بولا۔ ”آپ دونوں شریف آدمی ہیں بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔“

پولیس والے چلے گئے! سردار صفدر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔

”لوہے کے پٹنے دیکھے ہیں تم نے۔“ حمید ہنس کر بولا۔

”تم حقیقتاً یہاں سے زندہ نہیں جاسکتے۔“ صفدر چیخ کر بولا۔

”ارے تم نے پھر وہی شروع کر دیا۔“

دفعۃً تین چار آدمی حمید پر ٹوٹ پڑے۔ اُس نے جدوجہد کرنی چاہی لیکن سردار صفدر نے

ریوالور نکال لیا۔

”چلو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔“ حمید اطمینان سے بولا۔ اُسے یقین تھا کہ فریدی اُس کی طرف

سے بے خبر نہیں ہوگا۔

”میرے پانچ ساتھی۔“

”انہیں بھی جہنم رسید کروں گا۔“ صفدر دانت پیس کر بولا۔

”خیر دیکھا جائے گا۔“

”گرم پانی اور تولیہ لاؤ۔“ صفدر نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔ پھر حمید سے بولا۔ ”میں تمہاری

اصلی صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”وہ تو تم بڑی دیر سے دیکھ رہے ہو۔“

گرم پانی فوراً ہی آگیا۔ شاید وہ انجن کی ٹینکی سے لایا گیا تھا۔

سردار صفدر کو بڑی مایوسی ہوئی۔ سارا پانی ختم ہو گیا لیکن حمید کے چہرے میں کوئی فرق واقع

نہیں ہوا۔ حمید پہلے ہی سے مطمئن تھا۔ فریدی نے اُس میک اپ کے سلسلے میں اپنا مخصوص

طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس میک اپ کو ایسویا کے علاوہ دنیا کی کوئی دوسری چیز ختم نہیں کر سکتی تھی۔

”تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟“ سردار صفدر نے جھنجھلا کر پوچھا۔

”جہاں کہیں بھی ہوں گے چند گھنٹوں کے اندر اندر تم سے آکھڑیں گے۔“ حمید بولا۔ ”اور

اب میں تم سے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ تم ناقابل اعتماد ہو۔ تم نے

پولیس کو تو اپنی اسکیم میں شریک کر لیا تھا لیکن یہ نہ سوچا کہ میں بھی کچھ کر سکتا تھا۔“

”کیا کر سکتے تھے؟“

”تمہارا راز فاش کر سکتا تھا۔“

”لیکن ثبوت نہ مہیا کر سکتے۔“ سردار صفدر نے قہقہہ لگایا۔

”لیکن یہ تو ثابت ہی کر سکتا تھا کہ تم سردار صفدر ہو۔“

”خیر وہ موقع تو تمہارے ہاتھ سے نکل ہی گیا۔“ سردار صفدر نے کہا۔

”میں اپنے معاملات خود ہی طے کرنے کا عادی ہوں۔“

”ابھی طے ہوا جاتا ہے تمہارا معاملہ بھی.... مگر نہیں.... ابھی تو وہ پانچ بھی باقی ہیں۔“

حمید بدستور مسکراتا رہا۔

”دلاور نگر والا سونا کب آرہا ہے۔“ سردار صفدر نے دفعتاً حمید کی گردن دبا کر کہا۔

اسے دو آدمیوں نے بُری طرح جکڑ رکھا تھا۔ اس لئے وہ جدوجہد نہ کر سکا۔ صفدر کی گرفت تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی سی دیر تک وہ برداشت کرتا رہا۔ لیکن پھر اس کی کنپٹیاں سنسنانے لگیں اور آنکھوں کے سامنے گہرا تاریک دھواں لہرانے لگا۔ دھوئیں کے لہریں تہہ در تہہ بہتے چلے گئے اور پھر مکمل تاریکی.... گہرا اندھیرا۔

اور پھر دوبارہ ہوش آنے پر ایک بہت ہی تیز قسم کی روشنی کے احساس سے اس کی آنکھیں دکنے لگیں۔ چھت سے لگا ہوا ایک بہت بڑا بلب چکا چوند پیدا کرنے والی روشنی پھیلا رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک وہ حیرت سے چاروں طرف دیکھتا رہا اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک بہت بڑے صندوق میں بند ہو۔ کمرہ چوکور تھا اور شاید دیواروں کی اونچائی بھی اتنی ہی رہی ہو جتنی فرش کی لمبائی یا چوڑائی تھی۔ اس میں کوئی دروازہ تھا اور نہ کھڑکی حتیٰ کہ دیواروں میں کہیں کوئی جوڑ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ چھت کے قریب ہر دیوار میں ایک ایک روشندان تھا جن میں ہوا صاف کرنے والے پگھے گردش کر رہے تھے اگر حمید کو وہ پگھے نہ دکھائی دیتے تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ کسی قبر میں دفن کر دیا گیا ہے اور اب نکیرین سوال و جواب کیلئے آنے ہی والے ہیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دفعتاً اُس کے منہ سے حیرت کی چیخ نکل گئی۔

”سونا....!“ وہ بے ساختہ بولا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اتنا سونا شاید زندگی میں پہلی بار دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ صندوق نما کمرے کے ایک گوشے میں

سونے کا بہت بڑا ڈھیر جگمگا رہا تھا۔

پھر اُسے اور بھی چیزیں نظر آئیں اور اُن چیزوں نے اُسے کیمیا کا وہ نسخہ یاد دلادیا جس پر اُس نے اور فریدی نے کافی دیر تک بحث کی تھی۔

سیسے کی بڑی بڑی سلاخیں ہڑتال۔ گندھک اور طوطیا کے کے ڈھیر۔ پتھر کی بڑی بڑی بوتلیں جن میں پارہ بھرا ہوا تھا۔

حمید اپنی موجودہ حالت بھول کر فریدی کے اندازے پر عیش کرنے لگا۔ حقیقتاً وہ ابھی تک خود کو اس کیس کا ہیرو سمجھتا رہا تھا۔ مگر اس وقت وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر فریدی کی ہمہ گیر معلومات کا ذخیرہ اُسے نہ آتا تو وہ بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

شروع سے اب تک کے واقعات تیزی سے اُس کے ذہن میں گردش کرنے لگے مگر ایک خلش..... بیچاری سارہ.... اور وہ شہزادے والی بات.... وہ بیچاری مفت میں ماری گئی۔ مگر کون جانے وہ سچ سچ ان کی ساتھی ہی رہی ہو اور انہوں نے کسی اور مصلحت کی بناء پر اُسے قتل کر دیا ہو۔ بہر حال غیر شعوری طور پر اُس کا ذہن اس خیال سے گریز کر رہا تھا کہ وہ اسی کی بدولت ماری گئی۔

متحرک خزانہ

تھوڑی دیر بعد حمید اُس صندوق نما کمرے کی دیواریں ٹٹولتا پھر رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یہاں کس طرح لایا گیا۔ چاروں دیواریں سپاٹ اور چکنی پڑی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اُسے یہیں مرنا پڑے گا۔

اُسے گھٹن ہونے لگی لیکن وہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔ گھٹن کا احساس تازہ ہوا کی کمی پر نہیں تھا۔ نہ جانے کس طرح اُن پنکھوں نے اس کمرے کی فضا کو اس قابل بنا رکھا تھا کہ اس میں آدمی زندہ رہ سکے۔ ویسے بظاہر کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی تھی جسے تازہ ہوا کی گذر کا ذریعہ سمجھا جاسکتا۔

اس نے آنکھ بند کر کے یہ محسوس کرنے کی کوشش کی کہ اس کے گرد بیکراں وسعتیں ہیں اور سر پر نیلا آسمان پھیلا ہوا ہے۔ وہ دراصل اس احساس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا کہ وہ ایسی

دیواروں میں مقید ہے جن میں کوئی دروازہ نہیں ہے کیونکہ یہی احساس ساری گھٹن کا باعث تھا اور گھٹن اس پر غشی بھی طاری کر سکتی تھی اور موت کا ذریعہ بھی بن سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ ایک بہت بڑے راز کی تہہ تک پہنچ گیا ہے۔ سونے کا ڈھیر اُسے بے وقعت معلوم ہونے لگا وہ یہ بھی نہیں سوچ رہا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ اُسے کارخانے میں داخل ہوئے بارہ گھنٹے گزر چکے تھے کبھی کبھی وہ گھڑی کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ دس بج چکے تھے اور اُسے اپنے جسم میں نقاہت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ نہ جانے اُس نے کتنی دیر سے پاپ نہیں پیا تھا لیکن تمباکو نوشی کی خواہش بھی جیسے مر گئی تھی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ تازہ دم ہونا ہی نہیں چاہتا تھا اُسے اپنے ذہن کی اونگھتی ہوئی سی کیفیت اس وقت بڑی غنیمت معلوم ہو رہی تھی اور وہ تصویریت کے مکتب خیال کے فلسفیوں کی طرح اس کیفیت کو ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ تمباکو کے دو تین کش اس کیفیت کا خاتمہ کر دیتے اور وہ پھر سے اُسی گھٹن کا شکار ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ اس پر غنودگی طاری ہوتی گئی اور وہ فرش پر ایک طرف لڑھک گیا۔

پھر شاید وہ کسی قسم کا شور ہی تو تھا جس سے اُس کی نیند اچٹ گئی تھی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ پھر چکر اکر گر پڑا۔ صندوق نما کمرہ بل رہا تھا۔ اُس کے فرش کے نیچے اُسے کچھ ایسی گھڑ گھڑائیں محسوس ہو رہی تھیں جیسی ریل کے پہیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ برقی قتمہ جو چھت میں روشن تھا اچانک بجھ گیا۔ حمید سمجھا شاید اُس کی زندگی ہی کا چراغ گل ہو گیا۔ گھٹن کے لئے وہ دیواریں ہی کیا کم تھیں اُس پر سے اندھیرا۔

اور پھر وہ اپنی اُن آوازوں پر قابو نہ پاسکا جو ہسٹریا کے کسی مریض کی چیخوں سے مشابہ تھیں۔ کمرہ تیزی سے اوپر کی طرف اٹھ رہا تھا۔ پھر دفعتاً اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی چھت کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائی ہو۔ آوازیں تھم گئیں اور بلب پھر سے روشن ہو گیا۔ کمرہ بھی غیر متحرک تھا۔ پھر سامنے کی دیوار شق ہوتی معلوم ہوئی اور آخر کار ایک چھ فٹ اونچے اور تین فٹ چوڑے دروازے سے تاروں بھرا آسمان دکھائی دیا اور ساتھ ہی عجیب قسم کا شور بھی سنائی دیا۔ حمید نے بے ساختہ جست لگائی اور باہر نکل آیا۔ باہر بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی اور قریب ہی کہیں فائر ہو رہے تھے۔ حمید نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا جس میں اب بھی بلب روشن تھا۔ پھر اُس

نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہوا تھا جہاں چاروں طرف اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں اور یہ جگہ کافی طویل و عریض تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہاں کافر ش پنتہ ہے۔ بھلا اس پنتہ فرش کے گرد جنگلی اور خود رو جھاڑیوں کا مطلب؟ حمید کے ذہن میں سوال تیزی سے گونجا لیکن فی الحال اس میں اتنی تاب نہیں تھی کہ اس پر مزید غور کرتا۔

دفعۃً پھر ریل کے پیہوں کی سی گھڑ گھڑا ہٹ سنائی دی اور وہ کمرہ زمین میں دھنسنے لگا۔ حمید اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس پنتہ فرش کی طرف دیکھ رہا تھا اور اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ آخر وہ کمرہ کہاں گیا۔ فرش بالکل برابر تھا۔ حمید نے گھبرا کر اپنی ران میں زور سے چٹکی لی اور پھر اُسے یقین آ گیا کہ وہ اب تک خواب نہیں دیکھتا رہا تھا۔... اُس نے کتنی ہی دیا سلائیاں پھونک ڈالیں۔ لیکن فرش میں کہیں کوئی دراڑ یا رخنے نہیں دکھائی دیا اور ساتھ ہی یہ بات بھی اُس پر واضح ہو گئی کہ وہ کسی ٹینس کورٹ میں کھڑا ہے۔

گولیوں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں لیکن اب بھی کبھی کبھی کسی کی چیخ یا کراہ سنائی دے جاتی تھی۔ حمید ٹینس کورٹ سے نکل آیا اور یہ دیکھ کر اُسے حیرت نہیں ہوئی کہ وہ اُس کارخانے ہی کی چہار دیواری میں ہے۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا کہ اُس اندھیرے میں آہستہ آہستہ رینگتا ہوا چہار دیواری کے پھانک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دفعۃً پھر دھینگا مشتی اور توڑ پھوڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک آدھ فار بھی ہوئے۔

اب حمید کو فریدی کا خیال آیا۔ وہ اُس کی طرف سے غافل تو نہ رہا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے حملہ ہی کر دیا ہو۔ مگر پھر خیال آیا کہ فریدی وافر ثبوت اکٹھا کئے بغیر اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کر سکتا۔ وہ اُس کے غائب ہو جانے کے سلسلے میں تلاشی تو لے سکتا تھا لیکن حملہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

حمید عمارت کے سرے پر پہنچ کر مڑ ہی رہا تھا کہ اُس نے کسی کو تیزی سے دوڑ کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ اچھل کر دیوار سے جا لگا۔ دوڑنے والا اُس کے قریب سے گذر گیا تھا۔ پھر اُس نے ایک دوسرے آدمی کو بھی اسی طرف آتے دیکھا۔ وہ بھی دوڑ ہی رہا تھا۔ حمید چونک پڑا۔ حالانکہ دوڑنے والے کی شکل نہیں دکھائی دی تھی لیکن اُس کے دوڑنے کا انداز بتا

رہا تھا کہ وہ فریدی ہے۔ اس کی یہ دوڑ بھی نوعیت کے اعتبار سے کم حیرت انگیز نہیں تھی۔ فریدی نے تقریباً چھ ماہ تک اس طرح دوڑنے کی مشق کی تھی۔ دوڑتے وقت وہ اپنے پورے جسم کو کچھ ایسے زاویوں میں رکھتا تھا کہ انتہائی مشاق قسم کا کوئی نشانہ باز بھی اُسے اس حالت میں گولی نہیں مار سکتا تھا۔ مشق کے ابتدائی دور میں حمید اس پر غلیل سے چھوٹی چھوٹی کنکریاں چلایا کرتا تھا۔ پھر ایک وقت بھی آیا جب فریدی نے اس حالت میں اُسے ریوالور چلانے پر مجبور کیا۔

حمید نے سوچا کہ اُسے اپنی طرف متوجہ کرے لیکن قبل اس کے کہ وہ سنبھلتا فریدی غائب ہو چکا تھا۔ بہر حال اُسے اب یقین ہو گیا تھا کہ پولیس کپاؤنڈ میں موجود ہے۔

وہ پھر آہستہ آہستہ پھانگ کی طرف بڑھنے لگا۔ دفعتاً کسی طرف سے دو آدمی اُس پر ٹوٹ پڑے اور وہ قطعی بے بس ہو گیا۔ پھر وہ دونوں اُسے کھینچ کر روشنی میں لائے۔ حمید نے خود کو پولیس کانسٹیبلوں کے نرغے میں پایا۔

انہوں نے تقریباً پندرہ بیس آدمیوں کو جھکڑیاں پہنا رکھی تھیں۔ انسپکٹر جگدیش اور ڈی۔ ایس۔ پی سٹی بھی موجود تھے۔ حمید کو وہ سب انسپکٹر بھی دکھائی دیا جسے سردار صفدر نے اُس کے لئے بلایا تھا۔

”سیٹھ دھنی رام....!“ وہ چیخ کر حمید کی طرف بڑھا۔

”اوہ....!“ ڈی۔ ایس۔ پی سٹی بھی اس کی طرف مڑا۔

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اُسے فریدی دکھائی دیا جو سردار صفدر کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔ سردار صفدر کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ اس طرح اچھل اچھل کر چل رہا تھا جیسے اُس کا ٹخنہ یا کوہا اتر گیا تھا۔ فریدی نے اُسے ایک کرسی میں دھکیل دیا۔

”سیٹھ دھنی رام تو مل گئے۔“ جگدیش نے حمید کی طرف اشارہ کیا۔

فریدی نے اُس کی طرف دھیان دیئے بغیر سردار صفدر سے گرج کر پوچھا۔ ”سر جٹ حمید کہاں ہے؟“

”میں کیا جانوں! میں نہیں جانتا۔“

”میں جانتا تھا.... میں جانتا تھا۔“ حمید بے اختیار چیخ پڑا۔

”کیا جانتے تھے؟“ فریدی اس کی طرف تیزی سے مڑا۔

”ان کم بختوں نے میرا دیوالہ نکال دیا۔ میں مر جاؤں گا۔“ حمید بدحواس ہو کر زمین پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”میرا ہارٹ فیل ہو رہا ہے ارے میں مرا۔“

اور پھر اُس نے ایسی آوازیں نکالنی شروع کر دیں جیسے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گا۔
 ”جھوٹا ہے.... جھوٹا ہے۔“ صفدر اپنی رائیں پیٹ کر چیخا۔ ”یہ جابر کا شاگرد ہے.... جابر کا۔“
 ”ارے میں مرا.... میرا روپیہ....!“ حمید نے پھر ہانک لگائی۔

”مکار.... سور.... کہنے....!“ سردار صفدر چلایا۔
 ”ہائے میں نے اُسی وقت پولیس کو اطلاع کیوں نہ دی۔“ حمید تقریباً رو کر بولا۔
 ”کب؟ کیا بات تھی؟“ ڈی۔ ایس۔ پی نے پوچھا۔

”یہ سالے....!“ حمید نے کہا اور شاید پھر وہ دو چار گالیاں بھی بکنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ
 ڈی۔ ایس۔ پی نے اُسے ڈانٹ دیا۔
 ”سیدھی طرح بتاؤ۔“

”انہوں نے نہ جانے کیوں ایک اینگلو انڈین لونڈیا کو ایک پولیس والے کے پیچھے لگا دیا تھا اور
 پھر وہ مار ڈالی گئی۔“

”بکو اس ہے....!“ سردار صفدر چیخا۔
 ”تم تھے کہاں۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔
 ”ارے کیا بتاؤں.... دھنی رام نے وہ دھن دیکھا ہے کہ بس رے بس۔“
 ”صاف صاف بتاؤ۔“

”ان لوگوں نے مجھے ایک تہہ خانے میں بند کر رکھا تھا جس میں سونا پنا پڑا ہے۔“
 سردار صفدر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”کہاں ہے.... وہ تہہ خانہ....!“
 ”اب تو پتہ نہیں کہاں ہے۔ ویسے کچھ دیر قبل ٹینس کورٹ پر تھا۔“
 اس پر سردار صفدر نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”آپ لوگ ایک پاگل آدمی کے چکر میں
 پڑے ہوئے ہیں۔ ٹینس کورٹ پر تہہ خانہ.... چہ خوب۔“

”ہائے.... میرا.... روپیہ.... میں مرا۔“ حمید نے پھر ہانک لگائی۔

وہ رات حمید کو بھی مجرموں کے ساتھ ہی حوالات میں بسر کرنی پڑی۔ سردار صفدر اور اُس کے ساتھیوں کو کڑی نگرانی میں رکھا گیا تھا حالانکہ اُن پر لگائے ہوئے الزامات میں سے ایک کا بھی ثبوت بہم نہیں پہنچا تھا لیکن سردار صفدر کے باندھ لئے جانے کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ایک مجرم تھا جس کو اب تک مردہ تصور کیا جاتا رہا تھا۔ رات بھر فریدی ایک ایک کر کے انہیں بلاتا رہا۔۔۔ اور پھر صبح صرف حمید کو حوالات سے نکال لیا گیا۔ وہ ابھی تک سیٹھ دھنی رام ہی والے میک اپ میں تھا۔ فریدی اُسے الگ لے گیا۔

”وہ تہہ خانے والی بات کیا سچ نہیں تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”قطعاً ٹھیک تھی۔“

”لیکن اُن میں سے کسی نے بھی اُس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ البتہ تمہارا معاملہ بالکل صاف ہو گیا ہے۔“

”شہزادے والی بات کیا تھی۔“ حمید نے بیساختہ پوچھا۔

”پھر بتاؤں گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”فی الحال یہ تہہ خانے والی بات صاف ہونی چاہئے ورنہ کچھ بھی نہ ہوا۔“

”میں نے آپ کو جو کچھ بھی بتایا ہے اُس میں سر مو فرق نہیں۔“

”مگر وہ ٹینس کورٹ!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کل رات بھی دیکھا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”کیا اُن میں سے کسی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ نقلی سونا بناتے رہے ہیں۔“ حمید

نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔؟“

”پھر میرا معاملہ کس طرح صاف ہوا۔“

”انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ دلاورنگر سے لائے جانے والے سونے پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے تھے اور محض اس کے متعلق صحیح اطلاع حاصل کرنے کے لئے انہوں نے سارہ کو پھانسا تھا۔“

فریدی حمید کو اُس کمرے میں لایا جہاں محکمہ سراغ رسانی اور سول پولیس کے آفیسر بیٹھے تھے۔

”کہئے سیٹھ صاحب! آپ ان لوگوں کے چکر میں کیسے پھنس گئے تھے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے

حمید سے پوچھا۔

”جناب والا یہ سیٹھ دھنی رام نہیں ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”کیا؟ کیا میں نہیں پہچانتا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی منہ بنا کر بولا۔

”یہ سیٹھ دھنی رام کی نقل ہے۔ میرا سر جنٹ حمید۔ اگر یہ نہ ہو تا تو ہم ان تک مشکل ہی

سے پہنچ پاتے۔“

پھر فریدی شروع سے پوری داستان دہراتا ہوا بولا۔ ”اس بیچارے کو پھانسنے کے لئے اُن لوگوں نے بڑا شاندار پلان بنا رکھا تھا۔ ایک رات جب یہ ہوٹل ڈی فرانس کے رقص میں حصہ لے رہا تھا مجرموں کے دو آدمیوں نے جو اُس اینگلو انڈین نرس کے قریب کھڑے ہوئے تھے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ شہزادہ بہت اچھا ناچ رہا ہے اور پھر انہوں نے بلند آواز میں اس پر اسرار شہزادے کی داستان چھیڑ دی جو عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے شوق میں اپنی ریاست سے یہاں بھاگ آیا تھا۔ سارہ نے اُن کی گفتگو صاف سنی اور چونکہ وہ فطرتاً رومان پسند تھی اس لئے اُس نے خود ہی حمید کی طرف جھلنا شروع کر دیا۔ حمید نے اُسے اپنا نام بتایا کیونکہ وہ پبلک لائف میں عموماً اپنی اصلیت چھپانے کے اصول پر کاربند ہے۔“

”اچھی عادت ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی سر ہلا کر بولا۔

”دونوں دو ہی تین دنوں میں کافی گھل مل گئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”پھر ایک دن دو تین مجرم سارہ سے ملے اور اُسے بتایا کہ وہ اُس کے دوست شہزادہ شاہد کی ریاست کے جاسوس ہیں اور اس سے یہ استدعا کی کہ وہ شہزادے کو راہ راست پر لانے میں ان کی مدد کرے، سارہ کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ ویسے اس نے حمید سے کئی بار پوچھا کہ وہ اپنی شہزادگی کو پردہ راز میں کیوں رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حمید اس سازش سے آگاہ نہیں تھا۔ اس لئے وہ اس بات کو سارہ کا مذاق سمجھتا رہا۔ وہ لوگ برابر سارہ سے ملتے رہتے تھے۔ سارہ نے انہیں بتایا کہ وہ اس بات کا اعتراف ہی نہیں کرتا کہ وہ شہزادہ ہے اس پر انہوں نے اُس سے کہا کہ وہ کسی دن اُسے کسی ایسی جگہ لائے جہاں وہ لوگ پہلے ہی سے موجود ہوں پھر وہ لوگ اُسی کی زبان سے کہلوادیں کہ وہ حقیقتاً شہزادہ ہے۔ اس طرح سازہ نے جہریالی کی سیر کا پروگرام بنایا اور وہاں اُن لوگوں نے حمید کو شراب پلا کر دلاور گٹر سے آنے والے سونے کے متعلق اطلاعات بہم پہنچانے کی کوشش کی۔ اتفاق سے حمید نے نشے کی

جھونک میں انہیں غلط اطلاع دے دی۔ لیکن وہ اُسے سچ ہی سمجھے تھے۔ پھر اُسی رات کو انہوں نے سارہ کو قتل کر دیا تاکہ حمید کو مشتبہ بنا کر محکمہ سراخ رسانی کو اُسی حادثے کے پیچھے لگا دیں اور آسانی سے اپنا کام کرتے رہیں۔ اُسی دوران میں آزاد بینک کے سونے کے متعلق اخبارات میں آگیا۔۔۔ اور میری توجہ کوؤں کے شکاریوں کی طرف مبذول ہو گئی۔

”لیکن ابھی تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ وہ نقلی سونا بنا کر اصلی سونے کی جگہ کھپا رہے تھے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”اتفاق سے حمید صاحب اس تہہ خانے کی سیر بھی کر آئے ہیں جہاں سونے کا ایک زبردست ڈھیر تھا اور وہ ساری چیزیں بھی تھیں جن سے نقلی سونا بنایا جاتا ہے۔“

”لیکن وہ تہہ خانہ ہے کہاں!۔۔۔!“

”مجھے یقین ہے کہ میں اُسے کھود نکالوں گا۔“ فریدی نے لاپرواہی سے کہا۔

اُسی دن دوپہر کو فریدی اور حمید پولیس پارٹی کے ساتھ اس کارخانے میں مزید چھان بین کر رہے تھے۔ سب سے پہلے وہ ٹینس کورٹ میں گئے۔

”سخت حیرت ہے۔“ فریدی متفکرانہ انداز میں بولا۔ ”اگر وہ کسی مشینی نظام کے تحت حرکت کرتا ہے تو وہ خود بخود اوپر کس طرح آیا اور پھر نیچے کیسے چلا گیا۔ خیر یہ بتاؤ کہ جب اُس نے اوپر اٹھنا شروع کیا تھا تو تم کیا کر رہے تھے۔“

”زندگی سے بیزار ہو رہا تھا۔“

”اوہ نہ! مذاق چھوڑو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم سے نادانستگی میں کوئی ایسی حرکت تو نہیں ہوئی تھی جس سے مشین چل پڑی ہو۔“

”میں شاید اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔“ حمید نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

دفعۃً فریدی کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑا۔ اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر اُس کے قدم تیزی سے مشینوں والی عمارت کی طرف اٹھنے لگے۔

حمید بھی اُسی کے ساتھ ہی ساتھ عمارت میں داخل ہوا۔ دونوں کئی کمروں سے گذرتے ہوئے ہوئے ایک بڑے کمرے میں آئے جہاں تاروں اور کئی قسم کی مشینوں کا جال سا پھیلا ہوا

تھا۔ فریدی پہچہ دیر تک خیالات میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک ڈانٹا موچلا دیا جس کے ساتھ ہی کمرے کی ساری مشینیں چلنے لگیں اور ان کے شور سے کان پھٹنے لگے۔

فریدی پھر پتہ دیر تک رک کر شاید پہچہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

اچانک وہ حمید کی طرف مڑ کر بولا۔

”اس کھڑکی سے ٹینس کورٹ صاف نظر آتا ہے۔ تم ذرا اُدھ کا دھیان رکھنا۔“

حمید کی نظر میں کھڑکی سے گذر کر ٹینس کورٹ پر جم گئی تھیں۔ دفعتاً وہ چیخ پڑا۔

”وہ آیا۔۔۔ ارے پھر غائب۔“

پھر وہ فریدی کی طرف مڑا جو ایک مشین کے سپنے کو پکڑے کھڑا منظر اربا تھا۔ کورٹ میں کھڑے ہوئے کا نشیبل بھی چیخنے لگے تھے اس کی حالت تو دیکھنے کے قابل تھی جو اس کمرے کے ساتھ ہی اٹھتا چلا گیا تھا اور پھر اس کے غائب ہوتے ہی زمین کی سطح پر آ گیا تھا۔

وہ دونوں دھڑکتے ہوئے ٹینس کورٹ میں آئے۔ حمید نے جتنی چیزیں اس متحرک کمرے میں پچھلی رات کو دیکھی تھیں جوں کی توں موجود نظر آئیں۔

آفسروں کو فون کیا گیا۔

اس واقعے کے آدھ گھنٹے کے بعد فریدی اسی مشینوں والے کمرے میں اپنے آفسروں کو اس سپنے کے متعلق بتا رہا تھا۔

”پچھلی رات کو میری اور سردار صفدر کی مدد بھیجے اسی کمرے میں ہوئی تھی۔ پھر میں اُسے دھکیلتا ہوا اس سپنے تک لایا تھا۔ اتفاقاً وہ اس مینڈل سے ٹکرایا اور پہیہ گھوم گیا۔ میں اُسے مینڈل ہی پر دبائے رہا۔ کسی طرح وہ پھر میری گرفت سے نکل گیا اور پہیہ اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس وقت جب میں حمید سے اس کے متعلق گفتگو کر رہا تھا تو اچانک مجھے رات کی بات یاد آئی اس وقت بھی مشین چل رہی تھی۔ اس کمرے کی پوری مشینری کا تعلق اسی متحرک تہہ خانے سے معلوم ہوتا ہے۔“

آزاد بینک کا سارا اصلی سونا اسی تہہ خانے سے برآمد ہوا اور کافی مقدار میں نقلی سونا بھی ملا۔

یہ سارا ہنگامہ ختم ہو جانے کے بعد سے اب تک سر جنت حمید کیمیا کے نسخوں کے پکڑ میں پڑا ہوا ہے۔ ”خون تیرہ“ کا معمد تو اس کے لئے سوبان روح بن گیا ہے وہ روز ہی کسی نہ کسی

کالی جاندار شے کا خون کڑوا لیا ہے.... کالی مٹی.... کالا لٹا.... کالی مرغی.... البتہ ہاتھیوں سے وہ پہلے بھی محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے۔

ایک دن ایک کلونی سی لڑکی کو بھی پکڑا لیا تھا لیکن بعد میں فریدی کو بتایا کہ اسے اس کا نام پتیم پتیم پتیم سامعلوم ہوا تھا اس لئے اس نے اسے ذبح نہیں کیا۔

تمام شد